شاہکار

فنکار

غلام الثقلین نقوی	صالحہ عابد حسین
سردار جعفری	شوکت صدیقی
ریاض الرحمن شروانی	رضیہ فصیح احمد
کرشن موہن	محمد عمر میمن
حرمت الاکرام	غیاث احمد گدی
شہریار	راج نرائن راز

راجہ مہدی علی خاں اور دوسرے

۱ روپیہ

اردو کے معیاری رسائل کا انتخاب پیش کرنیوالا واحد ماہنامہ

شاہکار

نمبر ۳۸

مجلس مشاورت

سیّد احتشام حسین
خواجہ احمد عبّاس
مہندر ناتھ
خلیل الرحمن اعظمی
مظفر شاہجہانپوری

مدیر
محمود احمد ہنر

قیمت
فی پرچہ ـــــ ایک روپیہ
سالانہ ـــــ دس روپے

دفتر شاہکار، ممتاز باغ لوکر گنج الہ آباد ۳
بمبئی آفس:۔ ڈائمنڈ لاج، سکنڈ پیر خاں اسٹریٹ، بمبئی ۸

ترتیب

افسانے

نظمیں

مضامین

غزلیں

مزاح

تبصرے

ممتاز الحق پرنٹر، پبلشر نے اسرار کریمی پریس، الہ آباد میں چھپواکر دفتر شاہکار، ممتاز باغ، لوکر گنج الہ آباد سے شائع کیا۔

اپنی بات

ہم نے اکثر اردو کے سلسلے میں اپنی ریاست یعنی یوپی کے اردو دوستوں کی بے علمی اور بے حسی کا رونا رویا ہے۔ یوپی اردو کا مولد و مسکن ہے اور اس زبان پر یوپی والوں کا دعویٰ غلط نہیں رہا۔ اسی لئے جب آزادی کے بعد یوپی میں اردو کو ختم کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں تو بجا طور پر ہمیں سب سے زیادہ تشویش ہوئی۔ لیکن ایک عجیب بات ہوئی کہ اردو کے لئے رونے دھونے اور حکومت سے فریاد کرنے کے علاوہ اس کی حفاظت اور بقا کے لئے عملی جد وجہد کرنا ہم عرصہ تک بھولے رہے۔ اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ اردو کے لئے جب بھی منظم طور پر کوئی تحریک چلانے کی بات آئی تو اردو دوستوں کے اختلافات سب سے پہلے سامنے آئے۔ انجمن ترقی اردو ہند کو مضبوط کرنے کے بجائے اسے کمزور کرنے اور دوسری تنظیمیں قائم کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ تعمیری اور ٹھوس کام کی طرف توجہ دینے کے بجائے محض جوشیلے بیانات اور الزام تراشیوں کو اردو کی خدمت سمجھ لیا گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آج انجمن ترقی اردو ہند کا مرکزی دفتر اسی ریاست میں ہونے کے باوجود، اردو کی جنم بھومی ہونے کے باوجود اور ہندستان کی سب سے بڑی ریاست ہونے کے باوجود اردو کے سلسلے میں یوپی سب سے پسماندہ ریاست ہے۔

ہم اب تک اسی کا رونا روتے تھے کہ یوپی میں معیاری اردو کتب یا اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنے کا شوق نہیں ہے لیکن ابھی پچھلے دنوں جے پور میں انجمن ترقی اردو ہند کی جو کل ہند کانفرنس ہوئی اس کی رپورٹ دیکھ کر تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بہار اور مدھیہ پردیش سے تو علی الترتیب ۶۶ اور ۵۳ نمائندے کانفرنس میں شریک ہوئے اور یوپی سے صرف ۳۱۔ بہار میں انجمن کی ۱۱۵ شاخیں ہیں اور یوپی میں صرف ۵۶۔ اور پھر بھی ہمیں شکایت ہے کہ حکومت ہمارے مطالبات پر توجہ نہیں دیتی۔ کاش اردو دوست اب بھی اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ اس وقت عمل کی ضرورت ہے، جد وجہد کی ضرورت ہے۔ باتیں بہت ہو چکیں اب اٹھئے اور کام کیجئے۔

محمود احمد ہنر



غلام الثقلین نقوی

سنہری ڈھول

اُس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی!

ذرا دیر بعد دروازہ کھلا تو اس نے پوچھا۔ "کیوں جی! آج گھر میں اتنی گمبھیر خاموشی کیوں ہے؟"

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ نیم وا دروازے میں ایک لجائی شرمائی اجنبی لڑکی کو دیکھکر وہ حیران ہو گیا۔

اُس نے ٹوٹے ٹوٹے الفاظ میں کہا۔ "اوہو......... میں......... تمھیں........"

شکیلہ نے باورچی خانے میں سے پکار کر کہا۔ "آیئے نا اندر! ابا جان آپ کا انتظار کر رہے ہیں"

وہ شکیلہ کے ابا جان یعنی ممیا سسر کے سامنے ادب سے جھکا۔ انھوں نے اس کی پیٹھ پر پیار سے تھپکی دیتے ہوئے پوچھا۔ "ماجد میاں! خیریت سے تو ہو؟"

"جی ہاں! آپ کی دعاؤں سے"

"شکیلہ کو گھر کا کام کاج نبٹانے میں بڑی زحمت ہوتی تھی۔ میں سائراں کو ساتھ لے آیا"

"سائراں!"

"میرے ایک مزارع کی بیٹی ہے"

"بڑا اچھا کیا آپ نے" ماجد نے کہا اور کپڑے اتارنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رات کے کھانے پر ماجد اور اس کے ماموں ایک میز پر بیٹھے۔ شکیلہ نے خود میز پر کھانا چُنا۔ پانی کا جگ اور گلاس سائراں لے کر آئی۔ ماموں کی موجودگی میں ماجد کو شرم محسوس ہوتی کہ سائراں کو نگاہ اٹھا کر دیکھے۔ البتہ جب سائراں نے گلاس میز پر رکھے تو ماجد کی نگاہیں اس ہاتھ کی مخروطی

انگلیوں پر پڑگئیں۔ اُسے حنائی پوروں میں گلاب کی نوخیز کلیوں کی نرمی اور حدت کا احساس ہوا۔

سائراں جگ اور گلاس رکھ کر چلی گئی تو ماموں نے کہا۔ "سائراں ایک سال سے ہمارے ہاں کام کر رہی ہے۔ اب خاصی تمیزدار ہوگئی ہے۔"

"مجھے ڈر ہے شہر کی بند فضا میں اس کا دل نہ لگا تو کہیں......"

"نہیں آجد میاں! شکیلہ بیٹی کی باتوں میں بڑی مٹھاس ہے، وہ اسے دو دن میں رام کر لیگی۔"

دوسرے دن اس نے حسب معمول دروازے پر دستک دی تو پھر دروازہ ذرا دیر سے کھلا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ "سائراں! ذری لپک کر آیا کرو نا۔"

اس کے جواب میں سائراں قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ سائراں اور قہقہہ! چند لمحے وہ حیران رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "شکیلہ! یہ تو پروفیسر والا لطیفہ ہوگیا۔"

"کون سا؟"

"ایک پروفیسر صاحب بڑے بدحواس اور غیر حاضر دماغ واقع ہوئے تھے"

"اندر آکر سنائیے گا۔"

"نہیں یہیں سُن لو۔ پھر مزا جاتا رہے گا۔ بھرے بازار میں ان کی کسی چیز سے ٹکر ہوگئی گھبرا کر کہنے لگے "معاف کیجئے گا بیگم صاحبہ!" ایک قہقہہ بم کی طرح پھٹا۔ انھوں نے جز بز ہوکر نگاہ اٹھائی تو سامنے ایک پُر وقار قسم کی گائے کو کھڑا دیکھ کر حیران ہو گئے۔ دوسری بار پھر فلسفے کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے جا رہے تھے کہ کسی شے سے ٹکرا گئے۔ غصے سے کانپ کر بولے "بڑے بدتمیز ہیں یہ لوگ کہ انھیں بازاروں میں کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔" ایک قہقہہ پھر بم کی طرح پھٹا تو پروفیسر صاحب آنکھ اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ سامنے ایک فیشن ایبل خاتون ہاتھ میں پرس اور نگاہوں میں غصے کی چمک لئے کھڑی تھیں۔"

شکیلہ نے ننھا سا قہقہہ لگا کر اس کے لطیفے کی داد دی۔

ماجد اکثر کھانا باورچی خانے میں بیٹھ کر کھایا کرتا تھا لیکن اگر کبھی کبھار اسے کوئی اچھی سی کتاب ہاتھ لگ جاتی تو وہ کھانا اپنے کمرے میں منگوا لیا کرتا تھا۔ ایک ہاتھ میں لقمہ۔ دوسرے ہاتھ میں کتاب کبھی کبھی لقمے کو منہ تک پہنچنے میں بہت اونچ نیچ کھانے پڑتے اور آج تو اُسے دُنیا کی بہترین کہانیوں کا ایک مجموعہ عاریتاً مل گیا تھا۔

اس نے اپنے کمرے میں سے پکار کر کہا۔ "شکیلہ! آج کھانا یہیں لے آؤ"

شکیلہ نے اس کے سامنے تپائی پر کھانا لگا دیا اور مُسکرا کر پُوچھا۔ "آج پھر کوئی کتاب ہاتھ لگ گئی؟"

"جی ہاں! ایک ہفتہ کے اندر اندر پڑھ کر واپس کرنی ہے"

ماجد نے ایک لقمہ توڑ کر شوربے میں بھگو لیا۔ دوسرے ہاتھ سے کتاب کا ورق اُلٹا۔ پھر لقموں اور لفظوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ کبھی کوئی لقمہ گلے میں پھنستا، کبھی کوئی لفظ اٹک جاتا اور ساری سطر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی۔ پھر ایک لقمہ نے گلے میں پھنس کر کہا۔ "پانی!"

شرر...... شرر...... اس کی نگاہیں خود بخود اٹھ گئیں۔ ایک اجنبی لڑکی ذرا جھک کر جگ سے گلاس میں پانی اُنڈیل رہی تھی۔ اس کے سر سے ڈوپٹے کا ایک کونہ کھسک گیا تھا اور ایک لٹ گندم کے پکے ہوئے اس سنہری خوشے کی طرح دمک رہی تھی جس پر ڈوبتے سورج کی ایک کرن آتشیں بوسہ بن گئی ہو۔ لقمہ گلے میں از خود اتر گیا۔ کالے کالے لفظ پھر سے اُڑے اور کتاب کا صفحہ سفید ململ کی طرح ڈھل کر رہ گیا۔

آج خواب گاہ میں اسے معمول کے خلاف کچھ تبدیلی محسوس ہوئی!

حسبِ معمول اس کے اور شکیلہ کے پلنگ ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ شکیلہ کے پلنگ کے پاس ننھے کا پنگھوڑا بھی تھا لیکن امجد اور شاہدہ کی چارپائیاں کہاں گئیں۔ یہ عقدہ جلد حل ہو گیا۔ شکیلہ نے ننھے کو پنگھوڑے میں لٹاتے ہوئے کہا۔ "اس کمرے میں سائرہ کا سونا مناسب نہیں تھا اور اکیلے میں سوتی ہوئی وہ ضرور گھبراتی۔ میں نے امجد، شاہدہ اور سائرہ کو دوسرے کمرے میں الگ کر دیا ہے۔"

"بچوں نے الگ ہونے کا بُرا تو نہیں مانا؟"

"نہیں تو۔ سائراں بڑی مزے مزے کی کہانیاں سناتی ہے۔"

ماجد نے شب خوابی کا لباس پہنا اور بستر پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا۔ شکیلہ مکان کے دوسرے کمروں کو بند کرنے کے لئے چلی گئی تو ماجد نے سوچا " میں کتاب خواہ مخواہ دوسرے کمرے میں رکھ آیا۔ ایک کہانی اور پڑھ لیتا۔ جب تک بجلی نہ بجھے گی، مجھے نیند نہ آسکے گی۔ کتاب کی ایک ایک کہانی کتنی دلچسپ ہے۔ میں کھانا کھاتے ہوئے بھی کتاب ہاتھ سے نہ دھر سکا۔ ایک ہاتھ میں لقمہ دوسرے میں کتاب کا صفحہ لقمہ گلے میں پھنس کر اتر گیا اور صفحہ دھل کر رہ گیا۔

کالے کالے لفظ پُھر سے کیوں اڑ گئے؟"

شکیلہ اس کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ اپنے بالوں میں سے پین نکال رہی ہے۔ لمبے لمبے سیاہ بال کندھوں پر بکھر رہے ہیں۔ شکیلہ کو ان بالوں کی طوالت اور سیاہی پر بہت ناز ہے۔ قدرت کی طرف سے شکیلہ کو ان بالوں کے علاوہ ایک خوبصورت جسم بھی عطا ہوا ہے۔ لیکن شکیلہ ان کے باوجود کبھی خوبصورت نہیں رہی۔ گندمی پھیکا پھیکا رنگ۔ رخساروں کی ہڈیاں ذرا ابھری ہوئیں۔ ناک تھوڑی چپٹی سی، آنکھیں کچھ اندر کو دھنسی ہوئیں لیکن ان آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہے، اس چمک میں آگ نہیں۔ فولاد کی ٹھنڈی ٹھنڈی تیز تیز روشنی ہے۔ شکیلہ نے ایک ایسے گاؤں میں پرورش پائی ہے جہاں کوئی اسکول نہیں تھا۔ اس نے اردو فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں شادی کے بعد تھوڑی سی انگریزی سیکھی۔ شہر کی دس سالہ رہائش میں عملی طور پر اس نے اپنی تعلیمی کمی کو پورا کر لیا۔ اب وہ بڑی اچھی اُردو بول سکتی ہے۔ عورتوں کے رسالے پڑھتی ہے۔ خانہ داری میں ماہر ہے۔ بچوں کی بڑی صحیح تربیت کر رہی ہے۔ پڑھی لکھی عورتوں میں بیٹھ کر ذرا سی کمتری بھی محسوس نہیں کرتی۔ اس کی گفتگو میں شہری تہذیب کا لوچ ہے۔ لہجے میں دھیما پن۔ نرم نرم الفاظ کی بارش میں ننھی ننھی بوندوں کی راگنیاں ٹپکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کی رفاقت میں زندگی کتنی اچھی گزر رہی ہے' اس میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں، ایک نرم خرام ندی کا پُرسکون بہاؤ ہے...... نرم خرام ندی ...... پرسکون بہاؤ...... ایک منزل ایسی بھی آتی ہے

جب پانی رُک جاتا ہے اور حرکت میں جمود پیدا ہو جاتا ہے، ٹھہرے ہوئے پانی سے بو آتی ہے
اور راگنیاں بھی باسی ہو جاتی ہیں......

کیا یہ منزل آ تو......

نہیں......

میں کن خیالات میں کھو گیا۔ ابھی شکیلہ جوان ہے۔ تین بچوں کو جنم دے کر جسم اپنی دل کشی
کھو بیٹھتا ہے...... وہ کھنچن، وہ تناؤ کہاں باقی رہتا ہے...... مجھے شکیلہ سے پیار ہے..
......اس کے جسم سے؟...... نہیں..... اس میں حرج بھی کیا ہے..... جسم پیار کا مادی
پہلو ہے...... اور پھر شکیلہ کی آنکھوں میں چمک موجود ہے...... اس کے بال ابھی تک
شب دیجور کی سیاہیاں لئے ہوئے ہیں......

یہ بال جو سردیوں کی کالی ابر آلود راتوں کا عطر ہیں......

ان میں سنہری جھلک ہے......

سنہری جھلک...... نہیں تو...... انگور کے پکے خوشوں کا رنگ...... خوشبو......
مستی...... کیف...... ٹپکتی ہوئی ارغوانی شراب...... سورج کی آخری کرن کا آتشیں
بوسہ......

"آپ سو گئے؟" شکیلہ نے پوچھا۔

ماجد نے کوئی جواب نہ دیا تو شکیلہ نے بتی بجھادی۔

سہ پہر کی چائے کے انتظار میں ماجد تپائی کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔
کہانیوں کی کتاب سامنے کی الماری کے خانے میں پڑی تھی۔ ماجد بڑے صبر سے کام لے
رہا تھا۔ دو تین کہانیاں باقی رہ گئی تھیں۔ اگر اس نے اب پڑھ لیں تو سونے سے پہلے رات کا وقت
کیسے گزر سکے گا۔ شکیلہ برآمدے میں سلائی کی مشین رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کٹ۔ کٹ۔ کٹ۔
مشین چل رہی تھی۔ شکیلہ اپنے ایک پرانے سوٹ میں کاٹ چھانٹ کر رہی تھی۔

"سائراں! چائے کا پانی اُبل گیا؟"

"جی! بی بی جی!"

مشین کی آواز بند ہوگئی اور خاموشی طاری ہوگئی۔

چند منٹوں کے بعد شکیلہ مسکراتی ہوئی آئی اور اس کے سامنے کرسی بچھا کر بیٹھ گئی۔

"چائے نہیں آئی شکیلہ؟"

"بس ابھی آیا چاہتی ہے۔"

"خود بخود۔"

"نہیں سائراں لائے گی۔"

"سائراں...... کیوں؟"

"اُسے میز پر چائے پلانے کی تربیت دے رہی ہوں۔"

"نہیں، یہ بات نہیں شکیلہ۔ اب تم میم صاحبہ بننا چاہتی ہو۔ اتفاق سے مفت کی نوکرانی جو ہاتھ لگ گئی۔"

"چلئے یہی سہی۔ اب ہم صاحب بہادر کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیا کریں گے۔"

باورچی خانے میں برتن کھٹکے، کڑ کڑا ایک پیالی ٹرے پر سے لڑھکی اور فرش پر گر کر چھن سے ٹوٹ گئی۔

شکیلہ بگولہ بن کر اٹھی اور آندھی کی طرح باورچی خانے کی طرف لپکی۔

"سیٹ کی ایک پیالی توڑ دی کم بخت نے۔" شکیلہ کی آنکھوں کی فولادی چمک برف کی سِل بن گئی تھی۔

"یہ تمھیں بڑا بننے کی سزا ملی ہے شکیلہ۔"

"آپ کیا جانیں۔ ایک پیالی کے ٹوٹنے سے میرے دل میں کتنا بڑا گھاؤ پڑ گیا ہے۔"

"اتنی تنگ دل نہ بنو شکیلہ، برتن ٹوٹتے رہیں گے۔ دل نہیں ٹوٹنے چاہئیں ورنہ شکستہ دل سائراں چند سال تو کیا چند گھڑیاں بھی اس گھر میں نہ ٹھہر سکے گی۔"

"میری بلا سے۔" شکیلہ نے شکردانی تلاش کرتے ہوئے کہا۔

"شکردانی تو لاؤ سائراں۔" شکیلہ غضب ناک آواز میں پکاری۔

سائراں نے کانپتے ہاتھوں سے شکردانی تپائی پر رکھ دی۔ جھکی ہوئی سائراں کی بڑی بڑی آنکھوں میں ندامت کے ساتھ ساتھ خوف زدہ وحشت بھی تھی۔ ماجد دل مسوس کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے بعد سائراں کا جھکا ہوا سر اٹھایا تو دوپٹے کا ایک کونہ سرک گیا اور نجانے روشندان کی ایک جھری میں کب سے ایک کرن اس لمحے کی منتظر تھی کہ تتلی کی طرح اڑی اور اس زلف میں الجھ کر جگنو کی لرزتی کانپتی چمک بن گئی۔

چائے کا ایک گھونٹ بھر کر ماجد شکیلہ کی موجودگی کو بھول گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ زمین ایک چکر لگا کر آسمان سے جا ملی ہے۔ کچھ ستارے ٹوٹ کر کہکشاں کی دھول میں بکھر گئے ہیں۔ کہکشاں کی دھول کا رنگ سنہری تھا۔ سائراں کے سنہری بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ سائراں کے قدموں پر دریائے ڈی کی طوفانی لہریں ٹوٹ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کسی رمیدہ آہو کی وحشت تھی۔ دریائے ڈی ...... سینڈز آف ڈی ...... او میری! گو اینڈ کال دی کیٹل ہوم۔ اینڈ کال دی کیٹل ہوم۔

شکیلہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ...... مہترانی ہو کہ رانی مسکرائے گی ضرور ......

یہ جوانی ہے جوانی گنگنائے گی ضرور ....

"تو گویا آپ کی جوانی گنگنا رہی تھی۔"

"ایک بہت پرانی انگریزی کی نظم کا ایک مصرعہ یاد آ گیا۔"

"ذرا اونچی آواز سے سنائیے۔ ہمیں محظوظ ہونے سے کیوں محروم فرما رہے ہیں آپ؟"

"نہیں بھئی!" اس نے پیالی خالی کرتے ہوئے کہا۔ "پھر کبھی سہی۔ اب تو ہم سیر کے لئے جائیں گے۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھر کر باہر نکل گیا۔

میری اس کے ساتھ چلتی رہی۔ سنہری بالوں والی میری جس کے قدموں پر طوفانی لہریں لوٹ رہی تھیں جس کے سنہری بال تیز ہوا کے جھونکوں میں اڑے جا رہے تھے۔ میری جو دریائے ڈی کے رتیلے پاٹ کو عبور کر کے اپنے مویشیوں کو بلانے جا رہی تھی۔

میری جو طوفانی لہروں میں ڈوب گئی۔

اور مچھیروں کے جال میں پھنس گئی۔

سنہری بالوں والی جل پری، مچھیروں کے جال میں نہیں اس کے تخیل کے جال میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

میری اور سائراں!

وہ ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔

اُس نے سوچا۔ میں جب کبھی سائراں کو دیکھتا ہوں ایک سنہری دھول میں کھو جاتا ہوں، سائراں کے سنہری بال اور حیران حیران سی آنکھیں تصویر کی میری سے ملتی ہیں اور یہ تصویر لڑکپن کی یادوں کے البم پر چپک کر رہ گئی ہے۔ مجھے اس سنہری جال کو اپنے گرد تنے اور بُنے جانے سے ضرور روکنا چاہیئے۔ سائراں آہستہ آہستہ میری زندگی کے معمول کا ایک جزو بن گئی تو یہ کیفیت یقیناً جاتی رہے گی۔

ماجد نے اپنے گرد ایک مضبوط حصار کھڑا کر لیا۔

اس نے اس حصار میں کوئی درز، کوئی روزن، کوئی جھری باقی نہ رہنے دی، ایسا نہ ہو کہ کوئی سنہری کرن در آئے اور اس کی پُرسکون زندگی کے پرخچے اڑ جائیں۔ وہ طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔

چند دن ماجد بڑا خوش خوش رہا۔

سائراں دن میں کئی مرتبہ اس کے سامنے آتی اور اسے کوئی دھچکا نہ لگتا۔ اس نے سمجھا کہ سائراں اس کے ماحول کا جزو بن گئی ہے۔

اُس نے کتنا کامیاب نفسیاتی تجزیہ کیا تھا اپنا؟

ایک ہفتہ، دو ہفتہ، تین ہفتے گزر گئے۔ وہ اور شکیلہ حسب معمول ساتھ ساتھ جڑے ہوئے پلنگوں پر سوتے رہے لیکن عجیب بات تھی کہ وہ ان دنوں خوب گہری نیند سوتا اور شکیلہ جاگتی رہتی، ان تینوں ہفتوں میں اس نے شکیلہ کے جسم کی آگ کو ایک بار بھی محسوس نہ کیا تھا، اور ایک صبح جب شکیلہ سو کر اٹھی اور پلنگ سے

نیچے اُتری تو اس کی بھی آنکھ کھل گئی۔ ابھی کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ شکیلہ نے بتی جلادی بکھرے ہوئے بالوں، سوئے سوئے چہرے والی اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں لپٹی شکیلہ نے انگڑائی لی تو اس نے کروٹ بدل لی۔

شکیلہ نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا "اٹھئے! کب تک سوتے رہیں گے آپ؟"

"میں تو کب کا جاگ رہا ہوں۔"

"جھوٹ! ساری رات تو میں جاگتی رہی۔ میں نے جب بھی دیکھا آپ کو سویا ہوا پایا اور آپ کے خراٹوں نے نیند دو بھر کر دی۔"

"یہ شکایت آج پہلی بار میں نے سنی۔"

"یہ میری شرافت تھی کہ آج تک میں نے شکایت نہ کی۔"

"میں تمھاری شرافت کی داد دیتا ہوں۔"

شکیلہ رات کا لباس اتارنے لگی تو بجلی کی تیز روشنی میں اسے شکیلہ کی یہ حرکت بڑی تیز اور عریاں محسوس ہوئی۔ لحاف میں برفانی لہروں کا ریلا آیا اور اس کا تن بدن سن ہو کر رہ گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ دیر تک بستر پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔

باورچی خانے سے برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں آتی رہیں۔

ناشتے پر شکیلہ اس کے ساتھ شامل نہ ہوئی۔

سائراں نے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بی بی پوچھ رہی تھیں آج شام انھیں نمائش پر لے چلئے گا؟"

"ضرور...... ضرور...... کون کون چلے گا؟"

"بی بی نے نہیں بتایا۔ پوچھ کر آؤں؟"

ماجد نے پیالی میں چینی ڈالی۔ چائے کا پانی انڈیلا، دودھ ملا کر چینی ہلائی۔ سائراں دبے پاؤں آئی اور تپائی پر تلے ہوئے انڈوں کی پلیٹ رکھ کر کہنے لگی۔ "بی بی کہہ رہی تھیں ہم سب جائیں گے۔"

"تم بھی چلو گی سائراں؟"

"جی.......میں.........مجھے کیا معلوم.......میں بی بی جی سے پوچھ آؤں؟"

"نہیں تو......بی بی تمھیں ضرور ساتھ لے کر جائیں گی۔ گاؤں سے آئی ہو تو تمھیں شہر کی رونق بھی دیکھنی چاہیئے"

سائراں بے اختیار مسکرا اٹھی، ماجد مسکرا پڑا۔ وہ حصار جو ماجد نے اپنے گرد کھڑا کر رکھا تھا، اسکی ایک ایک دیوار مست ہو ہو کر جھومنے لگی۔ اس نے کانپ کر سوچا" سائراں ابھی تک میری زندگی کے معمول کا مرنہ جزو نہیں ـــ بن سکی۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ مجھے حصار کو اور زیادہ مضبوط کر لینا چاہیئے۔

سائراں تم چلوگی نا؟ سائراں مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو۔

جی! میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں پر کہاں تک...... نجانے سفر کی کس منزل پر آپ میرا ساتھ چھوڑ جائیں۔

"یہ کون تھا؟ جسے ساتھ چلنے کی دعوت دی جا رہی تھی؟"

"سائراں؟" ماجد چونک گیا۔" اوہ! تم ہو شکیلہ؟"

"جی ہاں! میں ہوں شکیلہ"

"اگر اکیلے میں چائے پی جائے تو اسی قسم کی خود کلامی سے جی بہلایا جا سکتا ہے"

"سچ؟" شکیلہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

ماجد کو شکیلہ کی آنکھوں سے آنکھیں ملانی پڑیں۔ شکیلہ کی ذہین آنکھوں میں شک کی ایک دھیمی سی گھٹا چھا رہی تھی جیسے دن کی روشنی پر کالی رات کی ایک پرچھائیں۔

"آج آپ چائے میں شامل کیوں نہ ہوئیں؟"

"جس گھر میں تین بچے ہوں اور ان میں سے دو کو تیار کر کے اسکول بھی بھیجنا ہو، وہاں میم صاحب اور صاحب بہادر ایک بستر پر تو اکٹھے ہو سکتے ہیں لیکن ایک میز پر بیٹھ کر چائے پینے کا وقت نہیں نکال سکتے۔ میرا مطلب ہے......."

"شکیلہ!" ماجد نے چیخ کر کہا۔

"چھوڑیئے اس قصے کو۔ اگر آج شام نمائش پر جانے کا ارادہ ہو تو گھر کے سارے کام

جلد نپٹا کر تیار ہو جاؤں۔"

"ضرور...... ضرور...... لیکن کون جائے گا؟"

"سوچنے کی بات ہے۔ فی الحال آپ دفتر جائیں، میں فرصت کے اوقات میں اس مسئلے پر غور فرماتی رہوں گی۔ جب آپ آئیں گے تو اپنا فیصلہ سنا دوں گی۔"

دفتر میں سارا دن ایک عجیب سی بے کلی میں گزر گیا۔

واپس آکر اس نے چائے پی، آرام کیا، دو تین بار بہانے بہانے شکیلہ سے ملا بھی لیکن شکیلہ نے اپنے چہرے سے اپنا عندیہ عیاں نہ ہونے دیا۔ رات کا کھانا اس نے شام ہونے سے پہلے کھایا۔ شام ہوئی۔ کمروں میں قمقمے روشن ہوئے اور شکیلہ بن سنور کر آگئی۔ شاہدہ اور آجد اس کے ساتھ تھے۔

شکیلہ نے کہا "اللہ! آپ بھی کتنے سست ہیں۔ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔"

"بس جانِ من! آپ ہی کا انتظار تھا۔ دیکھئے! ابھی ایک منٹ میں تعمیل ارشاد ہوتی ہے۔"

جب وہ کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو شکیلہ نے کہا "ننھے کو دودھ پلا کر سلا دیا ہے۔ بوتل بھر کر رکھ دی ہے۔"

"لیکن؟" آجد نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ننھا؟"

"اکیلا نہیں رہے گا، سائراں کو گھر چھوڑے جا رہی ہوں۔" شکیلہ کے لہجے میں بھولپن تھا پر آجد نے محسوس کیا کہ شکیلہ کے الفاظ زہر کی بوندیں ہیں جو اس کی رگ رگ میں ٹپک رہی ہیں۔

جب وہ نمائش سے لوٹے تو آجد تھک کر چور ہو چکا تھا لیٹتے ہی اس کو نیند آگئی۔ آدھی رات کے بعد اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ شکیلہ جاگ رہی ہے۔ اس نے آہستہ سے کروٹ بدل لی تو شکیلہ نے کہا۔ "سنئے تو۔"

وہ خاموش رہا۔

"میری ایک بات سن لیجئے۔ پھر گھوڑے بیچ کر سوئیے گا۔"

"کہو!"

"کل شاہدہ کے اسکول میں مینا بازار ہے۔"

"بڑی خوشی سے جاؤ۔"

"شاید دیر ہو جائے۔ آپ سہ پہر کی چائے باہر سے پی آئیں۔"

"لیکن سائرہ تو گھر پر رہ سکتی ہے؟"

"میں سائرہ کو ساتھ لے جاؤں گی۔ ننھے کو خود اٹھائے اٹھائے پھروں گی تو مینا بازار کا کیا خاک لطف آئے گا؟"

"یہ بات آپ صبح بھی کر سکتی تھیں۔"

شکیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

ماجد کے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔

ایک میٹھا سا درد جاگ اٹھا۔

دیر تک یہ درد جاگتا رہا..... شکیلہ عجیب عجیب باتیں کرتی ہے..... رات کو جگا کر یہ بات کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا..... سائرہ گھر رہے یا ساتھ جائے مجھے اس سے کیا..... اب مجھے سونا چاہیے..... سو جانا چاہیے..... نیند میں کتنی راحت ہے..... اس کے شہپروں میں عطر بیز شراب آمیز ہواؤں کے سانس ہیں..... پھول سے نازک خواب..... شاخِ گل سے جھڑنے والی پتیوں کا دھیما راگ..... سنہری پتیاں..... سنہری خواب..... سینڈز آف ڈی..... او میری! گو اینڈ کال دی کیٹل ہوم..... ہوا کے طوفانی جھونکے..... گرد سے اٹا ہوا راستہ..... دھول کے بگولے..... ڈوبتے سورج کی شعلہ بداماں کرنیں..... ایک شعلہ لپکا اور دھول میں آگ لگ گئی۔ میری کے ہاتھ میں چھڑی تھی..... مویشیوں کے گلے میں گھنٹیاں بج رہی تھیں..... میری کے بال اُڑ رہے تھے..... اس سنہری دھول میں اٹا ہوا کالج کا ایک لڑکا ہاتھ میں سوٹ کیس اُٹھائے ہوئے اپنے ننھیال آ رہا تھا۔ اس رستے کے دونوں طرف خالی کھیت تھے جن میں نئی نئی کٹی ہوئی گندم کے ٹھنٹھ چمک رہے تھے۔ اس لڑکے نے دھول اور مویشیوں میں سے رستہ بنا کر گزرنا چاہا تو میری نے اُسے موٹی موٹی حیران آنکھوں سے دیکھا اور پھر کہا "گوری کو سینگ مارنے کی عادت ہے۔"

"گوری! کون گوری؟" کالج کے لڑکے نے پوچھا۔

لڑکی نے اشارے سے بتاتے ہوئے کہا "وہ جو سب سے الگ الگ چل رہی ہے"۔

لڑکے نے اس سمت میں دیکھا۔ گوری بھرے بھرے گدرائے ہوئے جسم کی خوبصورت گائے تھی جو سارے گلّے سے الگ اٹھلا اٹھلا کر چل رہی تھی۔

وہ لڑکا رستے سے ذرا ہٹ کر کھیت میں سے ہو کر گزر گیا۔ کچھ دور جا کر رُکا۔ اسے میری نظر نہ آئی۔ میری اور اس کے درمیان دھول کی دیوار حائل ہو گئی تھی...... سنہری دھول..... سینڈز آف ڈی..... سمندر کا تلاطم..... موجوں کا شور..... کف برلب لہروں کے جھومتے لہراتے ہوئے پہاڑ..... اس کی دنیا دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح اڑ گئی.....

اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کا جسم سرد تھا۔ اس کی پیشانی تپ رہی تھی۔

پیشانی پر پسینے کے قطرے برف بن کر جم گئے تھے۔

شکیلہ دھیمی دھیمی آواز میں کھانسی۔

دھیمی، میٹھی پُراسرار سریلی آواز میں جیسے تخلیق پر آمادہ قمری اپنے رفیق زندگی کو بلا رہی ہو۔

ماجد اس پکار کو سمجھ گیا۔

ایک لمبی یکساں اکتا دینے والی متاہل زندگی کے ساز پر کبھی کبھار یہ نغمہ بیدار ہوتا ہے۔

حیا آلود نسائیت کا سب سے بڑا تحفہ..... اس کی ایک تان پر کوثر و سلسبیل کے چشمے پھوٹ بہا کرتے ہیں اور ان میں جہنّم کی سیال آگ بھی مل جاتی ہے۔ آگ اور پانی، شعلہ و نور کی آمیزش، مگر آج اس نوائے سرمدی کے فردوس میں صرف برفانی ہوا کے جھکڑ چلے اور ماجد منجمد ہو کر کروٹ بھی نہ بدل سکا۔ اس نے اندھیرے میں شکست خوردہ نسائیت کے جلتے پھنکتے آنسو نہ دیکھے۔

لیکن جب بوجھل نیند تلے پِسا ہوا چور چور جسم جاگا تو ماجد نے دیکھا کہ شکیلہ پلنگ کے پاس کھڑی ہو کر بکھرے ہوئے بال سنوار رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں رات کے آنسو انگاروں کی طرح جل رہے ہیں۔

ماجد دفتر سے سیدھا گھر کی طرف لوٹا۔

گھر کے قریب اُسے خیال نہ آیا کہ آج شکیلہ نے اُسے گھر آنے سے پہلے کسی ہوٹل میں چائے پی آنے کو کہا تھا۔ اس کا چائے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کسی دوست کے ہاں جاکر سہ پہر گزارنے کو بھی دل نہیں مان رہا تھا اور سڑکوں پر آوارہ پھرنے کی اسے عادت نہ تھی۔

اُسے شکیلہ پر غصہ آیا۔

وہ گھوما اور کمپنی باغ کی طرف چلا گیا۔ یہاں ایک تنہا کونے میں اسے گھاس پر لیٹنے کی جگہ مل گئی اور نرم ٹھنڈے فرش پر لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو سڑکوں پر قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ وہ اٹھا اور سیدھا گھر کی طرف ہو لیا۔

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ کھلا اور آج اُسے دروازہ کھولنے والی پر شکیلہ کا دھوکا نہ ہوا حالانکہ سائراں شکیلہ کے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ یہ لباس شکیلہ کے جسم پر بھی پھبتا تھا اور سائراں کو اس لباس میں ملبوس دیکھ کر نجانے اُسے وہ رفعت محسوس کیوں نہ ہوئی جو اسے اُڑا کر امبر کی نیلاہٹوں میں تحلیل کر دیا کرتی تھی۔

"سائراں! تمھاری بی بی آ گئیں؟"

"جی ہاں! آئی تو تھیں پر ابھی ابھی ایک اور بی بی کے ساتھ تماشا دیکھنے چلی گئیں۔"

"شاہدہ اور امجد؟"

"وہ بھی ساتھ جانے کے لئے مچل گئے تھے۔"

"اور تنہا؟"

"پنگھوڑے میں سو رہا ہے۔ کھانا لاؤں؟"

"نہیں...... ابھی نہیں...... پہلے پانی کا ایک گلاس لاؤ۔"

کرسی پر بیٹھ کر اس نے سوچا۔ شکیلہ سینما بازار کے بعد تماشا دیکھنے کیوں گئی اور پھر سائراں کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر......

یہ سوال ایک ننھی سی لہر کی طرح اٹھا اور اس کے ذہن کے کناروں سے ٹکرا کر لوٹ گیا اور لوٹ لوٹ کر ٹکراتا رہا۔ لہروں میں طوفان آگیا، کنارے ٹوٹتے رہے اور لہریں چیختی رہیں۔ "بولو!"

"بولو! شکیلہ سائراں کو اکیلا چھوڑ کر سینما کیوں دیکھنے گئی؟"

"میں کیا جانوں"۔

"نہیں"۔ تم جانتے ہو، شکیلہ نے آج زندگی میں پہلی بار زہر کا ایک قطرہ چکھا ہے"۔

زہر کا ایک قطرہ!

زندگی کی چٹان سے ایک چشمہ پھوٹا۔

ٹپ...... ٹپ..... ٹپ

زہر کے قطرے ٹپکے۔

پھر ایک دھارا پھوٹ بہی۔

شر...... شر...... شر

پیالہ کناروں سے چھلک گیا تو کسی نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اس نے تلچھٹ تک پی کر پیالہ دور پھینک دیا۔

چھن سے پیالہ ٹوٹا اور دُور دُور تک فرش پر کرچیں بکھر گئیں۔

"یہ کیا ہوا؟" ایک گھبرائی ہوئی آواز نے پوچھا۔

"ایک پیالہ اور!"

"گلاس نہ لاؤں؟ پیالہ لاؤں؟"

"ہاں!"

چند لمحوں بعد ایک کانپتے ہاتھ نے پیالہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اسے زہر سے لبالب بھر دو"۔

"زہر سے!" کانپتی ہوئی آواز پکاری۔

ماجد قہقہہ لگا کر ہنسا، سائراں چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"سائراں! میں نے یونہی مذاق میں پانی کو زہر کہہ دیا تھا۔ لو اس پیالے میں پانی ڈالو۔"

سائراں دوڑ کر گئی، ایک جگ پانی کا لے آئی اور ماجد کے پیالے کو لبالب بھر دیا۔ ماجد غٹ غٹ پی گیا۔ سائراں نے جھک کر پیالہ اس کے ہاتھ سے لیا تو اس کی انگلیاں ماجد کی انگلیوں سے مس کر گئیں اور ایک سنہری لٹ اس کی پیشانی کو چھو گئی۔ ماجد نے حیران ہو کر سائراں کو دیکھا۔ پرانے ریشمی سوٹ کی نیلاہٹ چمک اٹھی۔ یکایک وہ فرش سے اٹھا اور دُھلے دُھلے آسمان کی گہری نیلی پہنائیوں میں کھو گیا۔

صدیوں بعد ایک آواز نے کہا۔ "میں نے کھانا لگا دیا ہے۔"

ماجد عرش سے فرش پر گر پڑا۔ اس نے کہا۔ "سائراں مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کچھ تو کھائیے۔ بی بی پوچھیں گی تو میں کیا جواب دوں گی؟"

ماجد کو یہ معصوم اصرار بہت بھلا لگا۔ اس نے سائراں کو ایک نظر دیکھا اور وہ مسکرا پڑا۔ یہ مسکراتی ہوئی نظر سر سے پاؤں تک کا سفر کر گئی۔ سائراں کے بیضوی چہرے پر جہاں سرخی اور سفیدی کو یوں ملا دیا گیا تھا جیسے شعلوں میں نور، اسے ایک عجیب گداز کا احساس ہوا۔ پلکوں کے گھنے سایوں میں اسے نکھلی ہوئی چاندنی نظر آئی اور چاندنی میں پلکوں کے سائے رقص کر رہے تھے جیسے ایک اتھاہ جھیل کے کناروں پر بید لرزاں کے جھکے ہوئے پودے لہرا رہے ہوں۔ یہ جھیل جو خوابوں کی دنیا تھی..... اور اس کی تہہ میں سے ایک دھندلا خواب نکل کر بولا۔ "سائراں! آج سے پندرہ سال پہلے میں تمھارے گاؤں گیا تھا اور تمھیں دھول بھری سڑک پر ملا تھا۔"

"مجھے؟....... پندرہ سال پہلے؟....... نہیں تو....... وہ میں نہیں تھی۔"

"نہیں! وہ تم ہی تو تھیں۔ ذرا مجھے پہچانو تو سہی۔ نہیں تم مجھے پہچان نہ سکو گی۔ میرے اور تمھارے درمیان دھول کی ایک سنہری دیوار حائل ہو گئی تھی۔ میں اس دیوار کو پار کر کے تم تک نہ پہنچ سکا تھا اور پھر تم دھول کے سمندر میں ڈوب کر میرے خیال کے جال میں پھنس گئی تھیں۔"

حیرت کے مارے سائراں کی پلکیں اٹھیں۔ چاندنی میں ارتعاش پیدا ہوا اور حیرت میں وحشت بھر گئی۔ سائراں کا رُواں رُواں کانپ گیا۔ جھیل کی مرتعش لہروں میں سے ایک لہر کنارے سے چھلک گئی۔

سائراں رم خوردہ آہو کی طرح بھاگی اور باورچی خانے میں جا کر چھپ گئی۔ دیر بعد ڈری سہمی سائراں پھر آئی۔ اس نے فرش پر سے ٹوٹے ہوئے گلاس کی کرچیں اکٹھی کیں، برتن اٹھائے اور واپس چلی گئی۔

جب شکیلہ سینما سے لوٹی تو خواب گاہ میں روشنی تھی اور ماجد بوٹوں سمیت پلنگ پر سویا ہوا تھا۔ شکیلہ نے دھیرے دھیرے اس کے بوٹ اتارے اور اسے لحاف اُڑھا کر کپڑے بدلنے لگی تو سوئے ہوئے ماجد نے کروٹ بدل لی اور قمقمے کی پوری روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو شکیلہ نے محسوس کیا کہ ماہ و سال نے الٹی زقند لگائی ہے۔ ماجد سترہ سال کا لڑکا بن گیا ہے جو اپنی بچپن کی منگیتر شکیلہ کو دیکھ کر شرما جایا کرتا تھا۔ شکیلہ کو ماجد کی یہ ادا بہت بھایا کرتی تھی۔ آج اس لمحے شکیلہ کو ماجد پر بڑا پیار آیا۔ اس کا دل پگھل گیا۔ اس نے جھک کر ماجد کی پیشانی پہ ہونٹ رکھ دیئے اور ماجد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک تتلی ناچی صبح کے ستارے کی ایک کرن نے رقص کیا۔ دھیرے دھیرے ماجد کے ہونٹ کھلے جیسے کوئی کلی چٹک رہی ہو اور نغمہ بن کر بکھر رہی ہو...... ایک دھیما سا نغمہ...... شکیلہ نے کان لگا کر سنا تو نغمے نے سرگوشی کی:

"او میری! گو اینڈ کال دی کیٹل ہوم"

شکیلہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔

ایک لمحے نے کہا۔ "ماجد بچپن کا کوئی خواب دیکھ رہے ہیں"۔

دوسرے لمحے نے پوچھا۔ "یہ خوابوں کی میری کون ہے؟"

اور یکایک شکیلہ کا پگھلا ہوا دل پھر پتھر کا ٹکڑا بن گیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کا زہر بھر گیا۔ وہ لپک کر اٹھی اور اس نے بتی گل کر دی۔

مسلسل تین دن اور تین راتیں ماجد نے سوتے جاگتے ایک خواب کی سی حالت میں بسر کیں جیسے اس پر نیند کی پریاں اپنے پروں کا سایہ کئے ہوئے ہیں۔

وہ دفتر جاتا اور دفتر سے سیدھا گھر آتا لیکن گھر میں وہ اور شکیلہ آپس میں کوئی بات چیت نہ کرتے۔ اس کا کھانا اور چائے سائراں لے کر آتی، تیسری رات کا کھانا تپائی پر رکھ کر سائراں چند لمحے ٹھٹھک کر

کھڑی رہی تو ماجد نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ سائراں محویت کے عالم میں اُسے تکے جا رہی تھی۔

ماجد نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ "سائراں! سچ جانو میں پاگل نہیں ہوں"۔

سائراں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

"تمھاری بی بی بھی پاگل نہیں، سائراں ہم دونوں کے درمیان ایک لمحہ حائل ہو گیا ہے۔ صرف ایک لمحہ، بس اس 'لمحے' پر غالب آ گیا تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا"۔

وہ جانتا تھا کہ سائراں اس کی بات نہیں سمجھ سکی۔ اس لیے اس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "سائراں! ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتاؤ گی نا؟"

سائراں کے اوپر کے ہونٹ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکے۔ اس نے گھبرا کر ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتی۔ میں سچ کہتی ہوں۔ آج سے پندرہ سال پہلے میں اتنی بڑی نہ تھی جتنی اب ہوں۔ نجانے ہمارے گاؤں میں آپ کیسے ملے تھے؟"

ماجد نے مسکرا کر سائراں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "نجانے کیسے؟"

سائراں نے ڈوپٹے کے پلو سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "سچ جانیے وہ میں نہیں تھی"۔

"ہاں سائراں! تم سچ کہہ رہی ہو"۔ ماجد نے آہ بھر کر کہا۔

تب ماجد نے کمرے میں ایک لباس کی غضبناک سرسراہٹ سنی۔

"ماجد صاحب! اس بیچاری لڑکی کو آپ کیوں پریشان کر رہے ہیں؟ جاؤ سائراں"۔

سائراں چلی گئی تو شکیلہ برفانی لہجے میں بولی۔ "ماجد صاحب! مجھ سے پوچھئے۔ آج سے پندرہ سال پہلے سائراں بیچاری گھٹنوں چل رہی ہو گی۔ وہ کیا بتا سکتی ہے؟ مجھے وہ قصہ سنائیے نا۔ شاید..."

"نہیں شکیلہ! تم نہ سُن سکو گی"۔

"مجھ پر اعتماد کیجئے۔ میں سننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کہیں......"

ماجد نے شکیلہ کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز دیکھی کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔ "آج سے پندرہ سال پہلے جب میں سترہ سال کا تھا گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے ننھیال یعنی تمھارے گاؤں گیا تھا۔ شام

ہونے والی تھی اور کچے راستے پر سنہری دھول اڑ رہی تھی۔ وہ لڑکی مویشیوں کو ہانک رہی تھی۔ اس کے سنہری بال ہوا میں اڑ رہے تھے..... پھر میرے اور اس کے درمیان سنہری دھول کی ایک دیوار حائل ہو گئی تھی۔"

"وہ آپ کے خوابوں کی دُنیا کی میری کون ہے؟"

"ساتویں جماعت کی نیلسن ریڈر میں ایک نظم تھی۔ اس کے ساتھ ایک سرخ بالوں والی میری کی تصویر تھی جو سینڈز آف ڈی کے پار اپنے مویشیوں کو بلانے گئی تھی اور طوفان میں گھر گئی تھی اور...."

"ماجد صاحب!" شکیلہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کو علم ہے اس وقت آپ کی عمر کیا ہے؟"

"ہاں!"

"اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ تین بچوں کے باپ ہیں۔"

"کہو! تم کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"یہی نا کہ اس عمر میں تین بچوں کے باپ کو اس قسم کے خواب دیکھنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اور میں آپ کو باخبر کر دوں کہ وہ میری جو آپ کو میرے گاؤں کی سنہری دھول میں نظر آئی تھی، اسی سائراں کی بڑی بہن تھی۔"

"بڑی بہن!" ماجد نے اچانک کرسی سے اُٹھ کر پوچھا۔

"جی ہاں! وہ میری ہم عمر تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ کے اور اس کے درمیان سنہری دھول کی دیوار حائل ہو گئی۔"

"دیوار!"

"اگر یہ دیوار کھڑی نہ ہوتی تو آپ کو رانجھے کی طرح جوگ لینا پڑتا۔"

"شکیلہ!"

"اب میں کہانی کو انجام تک پہنچا دوں تو بہتر رہے گا۔ وہ لڑکی گاؤں والوں کے لئے ایک مسئلہ بن کر رہ گئی تھی۔ گاؤں کے سارے نوجوان اس کی محبت کا دم بھرنے لگے تھے۔ اس کے ماں باپ پریشان ہو گئے تھے اور ابھی وہ رشتے کا فیصلہ بھی نہ کرنے پائے تھے کہ آپ کے خوابوں کی میری

نے خود ہی مسئلہ حل کر دیا۔"

"شکیلہ! ...... بس ...... !"

"ایک جیالا بڑھا اور اس جواں مرد نے ایک ہی ضرب سے سنہری دیوار کو مسمار کر دیا اور سوئمبر جیت کر سنجوگتا کو اڑا لے گیا۔"

ماجد لڑکھڑا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے چمکے۔

شکیلہ نے آواز دی "سائراں!"

سائراں دوڑ کر آئی۔

"میرا کھانا بھی یہاں لے آؤ۔ آج صاحب اور میم اکٹھے کھانا کھائیں گے۔"

"نہیں شکیلہ، میں نہیں کھا سکوں گا۔" ماجد نے آنکھیں کھول کر کہا۔

سائراں سامنے کھڑی تھی۔ ماجد کی نگاہیں ایک اڑتے ہوئے لمحے کے لئے سائراں کے چہرے پر ٹک گئیں، شکیلہ دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔

"جاؤ سائراں!"

شکیلہ نے اس انداز میں کہا جیسے ڈرامے کے ایک منظر پر پردہ گرا رہی ہو۔

اس سے اگلے دن ماجد نے سر درد کی شکایت کی۔

شکیلہ خاموش رہی۔

اس سے اگلے دن ماجد نے جسم کو ٹوٹتا ہوا پایا۔

شکیلہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

تیسرے دن جب ماجد دفتر سے لوٹا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن شکیلہ نے ماجد کی رسمی مزاج پرسی کرنے سے بھی گریز کیا۔

وہ کپڑے بدلے بغیر بستر میں گھس گیا۔ شکیلہ دبے پاؤں کمرے میں آئی تو لیٹے ہوئے ماجد کو ایک نظر دیکھ کر لوٹ گئی۔

یکایک ماجد نے کروٹ لے کر کہا "شکیلہ! پانی کا ایک گلاس تو بھجوا دینا۔"

"سائراں کے ہاتھ؟" شکیلہ کے لہجے میں طنز کا نشتر تھا۔

"سائراں؟"

"پر سائراں یہاں ہو بھی تو۔"

"کیا مطلب؟"

"آج ابا جان آئے تھے، وہ سائراں کو لے گئے۔"

"کیوں لے گئے؟"

"میں اپنے گھر میں سوئمبر نہیں رچانا چاہتی تھی۔"

"کس کا سوئمبر؟"

"ماجد پیا کا!"

"شکیلہ! پانی لاؤ۔"

"شکیلہ گلاس بھر کر لے آئی اور ماجد کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ ماجد کی آنکھیں بند تھیں لیکن پلکوں کے پیچھے سے آنسو ابل ابل کر تمتمائے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"ماجد صاحب! پانی پیجیے۔"

ماجد پانی پینے کے لئے نہ اٹھا تو شکیلہ نے اس کی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی کی جلد یوں سکڑی جیسے سانپ کے پھن نے چھو لیا ہو۔

شکیلہ کو جھٹکا سا لگا۔ پانی گلاس میں سے چھلک کر ماجد کی پیشانی پر گرا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور کہا "شکیلہ! وہ زہر کا پیالہ میں پورے کا پورا پی گیا، جس کا ایک قطرہ چکھ کر تم پاگل ہو گئی تھیں۔ تم نے معصوم سائراں کو خواہ مخواہ گھر سے نکال دیا۔ پہلے میرے ظرف کا امتحان تو کر لیا ہوتا۔ یہ تم نے ظلم کیا۔ بہت بڑا ظلم......"

صالحہ عابد حسین

ماماتا کا خزانہ

وہ بار بار بیوی کی نبض ٹٹول رہے تھے ۔ چہرہ سفید، آنکھوں کے نیچے سیاہ گڈھے، ماتھے پر فکر و تردد کی لاتعداد شکنیں، دل میں کتنی یادیں، کتنے پچھتاوے، کتنی غیر آسودہ تمنائیں، کتنے تشنہ ارمان ۔ مگر بیوی اس وقت ان کی پریشانی، بڑی بہن کی بدحواسی، چھوٹی بہن کی بے قراری، للو کی بے چینی اور منظور کی تڑپ ہر چیز سے بے خبر، بے نیاز جانے کس حال میں تھیں وہ جو ہر بے ہوشی کے بعد ہوش میں آکر مسکرا مسکرا کر سب کو دلاسا دیا کرتی تھیں، اس وقت جانے کیسی بے خبری تھی کہ آدھ گھنٹے سے کسی طرح ہوش نہ آرہا تھا ۔ ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد، ماتھے پر پسینے کے قطرے، نبض کا کہنیوں تک پتہ نہیں ۔ سانس کی آمد و شد برائے نام ۔

"بھائی جان ــــ ڈاکٹر اب تک نہیں آیا؟" بے قراری کے عالم میں چھوٹی بہن نے کہا ۔

"اب ڈاکٹر آکر کرے گا بھی کیا ۔" میاں نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا ۔

"نہیں نہیں بھائی جان ایسے نہ کہئے ۔" یہ چھوٹی چچازاد بہن انہیں اپنی ماں کی طرح چاہتی تھی ۔

"بیٹی صبر کا وقت ہے ۔ ہمت کا وقت ہے ۔" ماموں جان نے باہر سے آتے ہوئے کہا ۔ انکی گودوں کی پالی بھانجی آنکھوں کے سامنے جا رہی تھی، کمر کچھ اور زیادہ جھکی ہوئی، آواز کچھ اور زیادہ ٹوٹی ہوئی ــــ آنکھوں کی حسرت کچھ اور زیادہ گہری! "خدا خدا کرو ۔"

چھوٹی بہن کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے اور بڑی بہن سجدے میں پڑی ماتھا رگڑ رگڑ کر خدا سے اپنی بیٹی کی طرح پیاری بہن کی جان کی بھیک مانگ رہی تھیں۔

یکایک مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کی شمع جھلملائی، ڈوبتی نبض واپس آگئی، چہرے پر ہلکی سی سرخی جھلک آئی۔ پپوٹوں کے اندر پتلیاں تھرکیں، اور گہری شربتی آنکھوں کے دریچے دھیرے دھیرے وا ہوئے پتلیاں ایک دوسرے پھر تیسرے کی طرف مڑیں۔ ہونٹوں کے کونے ذرا سے پھڑکے اور ایک اداس مسکراہٹ ان پر کھیل گئی "وہ کیوں۔ کیا ہے۔ تم سب اتنے پریشان۔ کیا سمجھے۔ میں مرگئی ہوں۔" رک رک کر انھوں نے کہا۔

"نہیں خدا نہ کرے۔ باجی۔ آپ بیہوش ہوگئی تھیں تو ہم سب ذرا پریشان ہوگئے" چھوٹی بہن نے خوشی سے کپکپاتے لہجے میں کہا اور باورچی خانے سے یخنی لینے بھاگ گئی۔ ماموں ابا نے شکر کے لئے ہاتھ بلند کر دیئے۔ میاں کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے غور سے بیوی کی طرف دیکھا۔ یہ کیسی بدلی بدلی لگ رہی ہیں۔ آنکھوں کی یہ غیر معمولی چمک، ہونٹوں کی یہ معصوم مسکراہٹ!! سفید بالوں کا یہ ہالہ۔۔۔ آج ان کے چہرے پر یہ کیسا ملکوتی حسن ہے؟

کیا وہ انھیں چھوڑ کر جا رہی ہیں؟ ان کے سارے جسم میں تھرتھری پیدا ہوگئی

"ارے آپ تو کانپ رہے ہیں۔ آئیے ذرا میرے پاس بیٹھ جائیے۔"

بیوی نے التجا آمیز لہجے میں میاں سے کہا۔ کتنی حسرت کتنی آرزو تھی ان کی آواز میں۔

وہ ان کے پلنگ کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گئے اور بیوی کے پتلے زرد سبک ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ زندگی میں پہلی بار سب کے سامنے یہ ہاتھ انھوں نے تھاما تھا۔ آہ پرانی تہذیب کی یہ بندشیں و رسم و رواج کی جکڑ بندیاں اور ان دونوں کی اپنی شرمیلی طبیعتیں! وہ کبھی کھل کر گھل مل کر ایک دوسرے سے بات نہ کرسکے، جس تہذیب میں میاں کا فرض بیوی کی ضروریات پوری کرنا اور بیوی کا اس کی خدمت اور اطاعت تک محدود رہتا ہے۔ اف یہ رسمیں جن کی بدولت محبت کا خزانہ سینے کی گہرائیوں میں مدفون رہتا ہے۔ دوستی کی

نعمت ہاتھ آنے پر بھی کھو جاتی ہے۔

"آپ تو بہت پریشان نظر آ رہے ہیں؟" ان کے لہجے میں مسرت کی ہلکی سی جھلک تھی۔

"ہاں۔ نہیں۔ تو۔ میں ڈاکٹر کا انتظار کر رہا تھا" میاں نے بات بنانی چاہی۔

"میں۔ میں بے ہوش نہیں تھی۔ سو بھی نہیں رہی تھی۔ جانے کیسی کیفیت تھی۔ خواب بھی نہ تھا۔ بیدار بھی نہ تھی۔ کوئی بڑا شاندار۔ خوبصورت محل تھا۔ کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنیاں تھیں اس میں۔ بڑا خوبصورت باغ۔ رنگ رنگ کے پھول اور پرندوں کی آوازیں۔ اتنی پیاری اتنی پیاری۔ جیسے میرے بچوں کی آوازیں۔ میں۔ سفید چمک دار عجیب سا لباس پہنے ایک چاندی جیسے سفید تخت پر بیٹھی تھی۔ اور میرے ہر طرف سفید پھول۔ سفید موتیوں کی لڑیاں سی لٹک رہی تھیں، اور اتنے میں۔ اتنے میں.... میرے سارے بچے۔ سب کے سب ہنستے بولتے کھلکھلاتے آ کر میرے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ بھائی صاحب کے بچے، بھائی جان کے بچے، آپا اور باجی کے بچے۔ اور بٹیا کے بچے۔ منجھلی، بنو اور ہدایت کے بچے، اور۔ یہ میرا منظورا اور للوا۔ اور بٹیا سبھی تو وہاں تھے۔ سفید ریشمی کپڑے پہنے۔ میرے گلے میں باہیں ڈال رہے تھے۔ میرا منہ چوم رہے تھے۔ مجھے ستا رہے تھے۔ میرے ہاتھ سے چیزیں لے لے کر کھا رہے تھے" وہ دم لینے کو رکیں۔ میاں حیرت مجسم بنے بیوی کا چہرہ تک رہے تھے اور چھوٹی بہن کے ہاتھ میں یخنی کی پیالی کانپ رہی تھی۔

"مگر۔ مگر۔ ایک عجیب بات تھی صاحب۔ یہ سب کے سب بڑے چھوٹے یہ چار چار بچوں کی مائیں اور باپ۔ یہ سب میرے بچے۔ سب ہی تو چھوٹے چھوٹے تھے معصوم فرشتوں کے سے چہرے۔ جیسے اس وقت تھے، جب میں انھیں پالتی تھی۔ یہ سب اتنے چھوٹے کیسے ہو گئے تھے۔ کیا یہ خواب تو نہ تھا؟"

"مگر نہیں۔ نہیں۔ یہ خواب نہ تھا۔ میرے سب بچے میرے پاس آئے تھے۔ کام چھوڑ کر، امتحان چھوڑ کر، گھر چھوڑ کر میں ان سے مل لی۔ سب سے مل لی صاحب!"

"باجی ذرا سی یخنی پی لیجئے" بہن نے اصرار کر کے چند چمچے یخنی کے پلائے اور پھر

کورومین کی ایک خوراک بھی پلادی۔" اب آپ سو جائیے باجی۔"

"بٹیا۔ میں تو بہت سو چکی۔ اب۔ اب تو سونا ہی سونا ہے۔ آج ان سے باتیں کروں گی۔ جی بھر کر باتیں کروں گی۔" انھوں نے میاں کی طرف دیکھ کر کہا۔" ہاں ضرور" بمشکل وہ اتنا ہی کہہ سکے۔

"لکھنؤ سے آج بھی کوئی نہیں آیا؟" انھوں نے ذرا رک کر پوچھا۔

"نہیں" اور یہ کہتے کہتے میاں کے حلق میں آواز پھنس گئی۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں اپنے سسرالی عزیزوں کا کتنا انتظار ہے۔

"خیر نہ آئیں۔ خوش رہیں۔ آپ رنج نہ کیجئے۔ ہمارا کیا۔ ہم تو خدمت گزار تھے اب ان کو ہماری کیا ضرورت۔ زندہ رہیں سب۔ ہم اپنا سفر پورا کر چکے۔" میاں لاکھ کوشش پر بھی ضبط نہ کر سکے۔ آنسو ان کی سفید داڑھی پر ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح مسلسل گر رہے تھے۔

"باجی بڑے بھائی جان کا خط آیا ہے۔ کل وہ آرہے ہیں۔" بہن نے بات کا رخ بدلنا چاہا۔

"بھائی جان کل آرہے ہیں۔ ؟ ارے بٹیا کل تو بہت دور ہے۔ لمبا سفر ہے۔"

وہ خلا میں جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ بڑی آپا جانماز سے اٹھ کر ان کے برابر آکھڑی ہوئیں مگر شدت غم سے بید کی طرح کانپ رہی تھیں۔

"آپا۔ ہائے آپا۔ تمہارا کیا ہوگا۔" منہ ہی منہ میں انہوں نے کہا اور آنسوؤں کے سفید قطرے ان کی آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہو گئے۔ بچپن سے انہوں نے اپنی آپا کی ماں کی طرح خدمت کی تھی۔ کتنا سہارا تھا آپا کو ان سے۔

"تم ذرا آرام نہیں کرو گی؟" میاں نے کہا۔

آرام۔ ہاں ہاں اب تو آرام ہی آرام ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

مگر جیسے ہی میاں نے اٹھنا چاہا انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا "نہیں، نہیں آپ جائیے نہیں ۔ جانتی ہوں آپ کی نماز کا وقت ہے۔ آپ جیسا باخدا اور کون ہوگا بھلا مگر آج تو خدا معاف کر دے گا۔ مجھے کبھی نماز میں بھولنا نہیں ۔ دعاہیں یاد رکھنا میں بہت گنہگار ہوں کچھ بھی تو نہ کیا اس دنیا میں، جی بھر کر آپ کی خدمت بھی تو نہ کی۔" لہجے میں وہ خلوص جس میں بناوٹ کا نام ونشان بھی نہیں ہوتا۔ "آپ کو یاد ہے ــ جب ہم نے اسس جانہار کے بعد ــ منجھلی کو گود لیا تھا۔ کتنی ننھی سی کمزور تھی وہ ــ پر کتنی پیاری ــ افوہ ــ کس مصیبت سے پلی ہے۔ اور اب چار بچوں کی ماں ہو کر اپنے کو بہت بڑا سمجھنے لگی ہے ــ باؤلی۔" آواز میں ایسی جھنکار جیسے جل ترنگ بج رہا ہو ــ" اور میری بہن ہائے کتنا چاہتی تھی مجھے ۔ وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی ۔ وہ بھی تو وہاں ــ اس محل میں ــ" اور اپنی مرحومہ بھانجی کی یاد میں وہ پھر کھو سی گئیں۔

رانی ــ رانی ۔ کہاں ہے ــ ہاں ہاں ــ وہ تو پڑھ رہی ہے ــ اور میرا راجہ بیٹا ــ بیٹا دیکھنا تم میرے بچوں کو کبھی کچھ مت کہنا ــ نہیں تو ۔ نہیں تو میں خفا ہو جاؤں گی ــ" اور چھوٹی بہن لاکھ کوشش کرنے پر بھی اپنی ہچکیوں کا گلا نہیں گھونٹ پا رہی تھی ــ کتنا چاہتی ہیں وہ اس کے بچوں کو۔

ان کی آنکھیں اب بند تھیں ۔ جانے کن تصورات میں کھو گئی تھیں ۔ اور میاں ٹکٹکی انکے چہرے کو دیکھ رہے تھے اور کان میں ان کا یہ جملہ گونج رہا تھا ــ "میں نے کچھ بھی تو نہ کیا اس دنیا میں ۔ آپ کی جی بھر کر خدمت بھی تو نہ کر سکی ۔"

"کچھ بھی نہ کیا" بیوی کا مرجھایا ہوا ابھری ہوں پڑا چہرہ، سفید بال، بے رنگ ہونٹ اور بیماریوں کا مارا ہوا جسم دیکھتے دیکھتے ــ وہ جانے کس دنیا میں پہنچ گئے ۔ یہ بوڑھا بیمار چہرہ، جس پر کتنے ہی دکھوں کی پرچھائیاں تھیں، ماند پڑ گئی، یہ بیمار و نحیف جسم غائب ہو گیا....

ایک گلاب کے پھول کی سی رنگت، سرو کے سے قد بھرے بھرے جسم والی شرمیلی نازنین سیاہ بالوں کی لٹیں چہرے پر سے ہٹاتی ان کے سامنے تھی ــ حسن و جوانی کا ایک دلکش مرقع۔

"بھائی جان ڈاکٹر آگیا۔" وہ ایک دم چونک پڑے۔

"ڈاکٹر آیا۔ دیکھا بھالا۔ کچھ دوا دی۔ ایک انجکشن لگایا اور بے کچھ کہے سنے باہر چلا گیا۔ ان سے اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ پھر آکر بیوی کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے۔ جو شاید انجکشن کے اثر سے سو گئی تھیں۔

آہ۔ ان کی خدمت میں یہ پھول سی رنگت مرجھا گئی۔ سیاہ بال سفید ہو گئے۔ گدرایا جسم سوکھ گیا۔ وہ حسن و جوانی خواب و خیال ہو گئی! مگر — مگر ان کی سیرت کا حسن کتنا نکھر گیا۔ ان کی شخصیت کی دلکشی کتنی بڑھ گئی ہے۔

آج پہلی بار یہ ادراک ان کے اندر جاگا تھا کہ ان کی بیوی کیسی شخصیت اور کیسی سیرت کی مالک تھی۔ خاندان بھر کی محبوب، گاؤں بھر میں ہر دل عزیز، بچوں کی سرپرست و خدمت گزار، مردوں کے کئے قابلِ احترام اور عورتوں کے لئے قابلِ رشک ہستی — یہ ان پڑھ قصباتی شریف زادی جو نئی تعلیم، نئی تہذیب اور کلچر سے ناآشنا تھی۔ یہ سیدھی سادی معمولی ذہن و دماغ کی عورت کیسے اتنی محبت اتنی عزت، اتنی عقیدت کا مرکز بن گئی کیسے؟ کیسے؟؟

ان کے ذہن کے پردے پر چالیس سالہ بیاہتا زندگی کی تصویریں بن اور بگڑ رہی تھیں۔

نئی نویلی دلھن ساس سسر اور بھرے کنبے کی دن رات خدمت کر رہی ہے، بڑی نند اور جیٹھ کے لڑکے لڑکیوں سے، جو عمر میں تھوڑے ہی چھوٹے ہوں گے، یوں گھل مل گئی ہے جیسی ان کے ساتھ کی کھیلی سہیلی ہو۔

میاں کے لئے طرح طرح کی چیزیں پکا رہی ہے، چھپ چھپ کر اصرار کر کے کھلا رہی ہے اور ہر کام کے لئے دن رات مستعد رہتی ہے۔

وہ یار دوستوں میں سے رات گئے واپس آئے ہیں تو بیوی کو دیکھتے ہیں جو گرمی میں چولھے کے آگے بیٹھی اونگھ رہی ہے تاکہ انھیں گرم کھانا کھلا سکے۔

سب لوگ دسترخوان پر بیٹھ کر دنیا بھر کی نعمتیں کھا رہے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ

کھانا نہیں کھاتی۔ ان کے کان میں لوگوں کے فقرے پڑتے ہیں "انھیں کسی کے ساتھ کھانا پسند نہیں" اور وہ سوچتے ہیں۔ شاید چھپ کر زیادہ اچھا کھاتی ہو۔

وہ باورچی خانے میں جاتے ہیں تو اسے ملازم عورتوں اور لڑکوں کے درمیان بیٹھے موٹے اناج کی روٹی دال اور بچا کھچا سالن کھاتے پاتے ہیں، ان کی خفگی پر وہ ہنس کر کہتی ہے "مجھے تو یونہی پسند ہے" اور سب کی باتیں شیر و شکر کی طرح حلق سے اتار لیتی ہے۔

اڑوس پڑوس کی غریب عورتیں، رانڈ بیوہ، بڑھیاں، میاں کی ستائی بیویاں سسرال کی ماری لڑکیاں آتی رہتی ہیں اور اس کے ارد گرد جمع ہو جاتی ہیں، اپنا دکھ درد اس سے کہتی ہیں اس کی خدمت دل و جان سے کرتی ہیں، اور محبت کے میٹھے بول سے دل کا درد کم کر کے واپس جاتی ہیں، اور اکثر ہی نہیں ان کی جھولی یا مٹھی میں کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

یہ عالی نسب شریف سیدانی ان میلی کچیلی گنوار عورتوں میں یوں گھل مل کر بیٹھتی ہے کہ اس میں اور ان میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ دوسروں کا کیا ذکر، انھیں خود بعض وقت یہ برا لگتا ہے کہ لوگوں کے طنز و فقرے وہ تیکھی چتون کے ساتھ سہہ جاتی، کبھی کبھار الجھ پڑتی اس معاملے میں وہ شوہر تک کی ناراضگی کی پروا نہ کرتی۔ حالانکہ اس سے اس کا ہر حکم پورا کرنا وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتی تھی۔

وہ چھپ چھپ کر ہر ضرورت مند کی مدد کر رہی ہے۔ ہر دکھی کا درد کم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی اپنی پونجی تھی ہی کیا۔ کم حیثیت ماں باپ کی بیٹی، معمولی حیثیت کے شوہر کی بیوی۔ اور ساتھ ہی اتنی خود دار کہ باپ، بھائی، شوہر کبھی کسی سے کچھ نہ مانگا، کوئی حق نہ جتایا، ضرورت نہیں بتائی۔ مگر مصیبت زدہ کی مصیبت وہ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ جو بھی پاس ہوتا، تن کے کپڑے، کھانے کا اناج، اپنی ضرورت کے چند پیسے فیاضی سے دوسروں کی نذر کر دیتی۔ اور پھر کیسے کیسے بہانے بنا کر اپنے اس "عیب" کو چھپاتی ــــ وہ کبھی الجھ پڑتے، کبھی ہنس دیتے اس کی اس سادہ لوحی پر۔

ان کی نماز کا وقت کب کا نکل چکا تھا۔ ایک اداس مٹیالی شام کی پرچھائیاں

در و دیوار پر کانپ رہی تھیں۔ چھوٹی بہن اپنی باجی کے پاؤں دباتے دباتے وہیں پائینتی پر سر رکھ کر اونگھ گئی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے یوں ہی دن رات جاگتے اور خدمت کرتے بڑی آپا ہاتھ میں تسبیح لئے تخت پر آنکھیں بند کئے بیٹھی تھیں۔ ان کے آنسو خشک تھے مگر چہرہ ایک مجسم آہ بن گیا تھا۔

اس نے سوتے سوتے کروٹ بدلی اور کراہ کے ساتھ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی "للو۔ رانی — ننھی — منجھلی — راجہ"

آہ۔ اس وقت بھی اسے اپنا نہیں، اپنے پالے بچوں کا خیال ہے۔ للو، راجا، رانی، منجھلی ننھی ہی کیا، خاندان، پڑوسی اور گاؤں کے کتنے بچوں کو اس نے ماں کا پیار اور خدمت بخشی تھی۔ ماں تا کا یہ سرچشمہ، جو دریا کے کنارے پیاسا رہا۔ جسے خود اولاد کی والہانہ محبت کی نعمت کبھی نصیب نہ ہوئی۔ جس کو وہ خدمت، وہ پیار، وہ اپنائیت نہ مل سکی جو ہر ماں کا حق ہوتا ہے۔ کسی نے سچ دل سے اسے ماں نہ سمجھا۔ بچے پل جاتے، بڑے ہو جاتے تو اپنے ماں باپ کے پاس چلے جاتے — کبھی کبھی بے دردی سے اس سے چھین لئے جاتے اور وہ اپنی زخمی ماں تا پر پھایا رکھنے کے لئے کسی اور بچے کی خدمت میں لگ جاتی۔

آج ان کو پہلی بار، اس بھیانک سناٹے، اس خوفناک خلا، اس دلدوز محرومی کا، اس پیار کی بھوک کا احساس ہو رہا تھا، جس کا سامنا محبت سے بھرپور اس دل کو پینتیس ۳۵ سال تک کرنا پڑا تھا — جس نے اپنی الٹی ماں تا کے یاد میں عمر بھر محبت کی دولت لٹائی اور بدلے میں کچھ نہ چاہا کچھ نہ پایا۔

انھوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، آنکھیں بند کر لیں — انھیں ایسا لگا جیسے ان کا تین برس کا تندرست و تندرست بچہ ان کے گلے میں باہیں ڈالے بیٹھا ہے ....

اور بیوی کی وہ مسرور و مغرور صورت ان کی نظروں میں پھر گئی، جب وہ شاخ تمنا کے بار سے بوجھل، حیات آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ان کے سامنے آتی تھی۔ ماں بننے کی امید کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس سے پہلے یہ

شرف نہ کسی عورت کو ملا ہے نہ آئندہ ملے گا۔۔۔۔ اور پھر جب انہوں نے اپنے پیارے بچے کے چہرے پر پہلی نظر ڈالی تو دونوں کے دلوں میں محبت ایک نئی کرن جگمگائی، امید کا ایک سنہرا سورج طلوع ہوا۔ دوستی کا ایک اٹل احساس پیدا ہوا۔

آج ــ آج وہ زندہ ہوتا تو چھتیس برس کا کڑیل جوان ہوتا۔ ماں کا سہارا باپ کی ضعیفی کا آسرا ــ مگر ــ یہ تندرست بچہ وبا کی بیماری میں یوں چٹ پٹ ختم ہو گیا جیسے کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا، اور ان کی بیوی ــــ نوجوان، شگفتہ مزاج تندرست لڑکی، ایک دم بالکل بدل گئی۔

اس کا غم کتنا گہرا، کتنا سخت تھا!! مگر اس کی بے پناہ قوتِ برداشت اور صبر کی وجہ سے اس کا پورا اندازہ کسی اور کا کیا ذکر وہ خود بھی نہ لگا سکے۔ وہ تو خود غم کے ساگر میں یوں ــ ڈوب گئے کہ جیسے کسی اور کی خبر ہی نہ رہی۔ ماں کی اس بھڑکتی آگ کی لپٹ بھی نہیں پہنچی اس نے نوجوان ماں کے دل میں آبلے ڈال دیئے تھے۔

اور پھر ــــ برسوں ــ بس یہ آس لگائے رہے کہ اس کی شاخ تمنا پھر سے ہری ہوگی۔ اس کی گود اور ان کا دل پھر آباد ہوگا۔ مگر آس بندھتی اور ٹوٹ جاتی۔ ماں کی گود خالی اور باپ کا دل سونا ہی رہا ــــ لوگوں نے بہت چاہا وہ دوسری شادی کرلیں مگر انھوں نے نفارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس تجویز کو رد کر دیا۔ خدا کی مرضی اور مشیت میں کسی کو دم مارنے کی مجال ہے! ایک بے گناہ کو اس قصور کی سزا کیوں دی جائے، جس میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ــــ اور انھوں نے اپنی مایوسی اور غم کو خدا کی عبادت اور محبت میں ڈبونے کی کوشش کی وہ غیر محسوس طور پر بیوی سے دور ہوتے گئے۔ دوستی اور محبت کا جو پودا اس ننھے فرشتے کے سائے میں پروان چڑھ رہا تھا اس کی باڑھ ماری گئی۔

مگر بیوی؟ اس نے کیسے اس غم کو، اس محرومی کے درد کو جھیلا؟

آج پہلی بار ان کو درد کی ان ٹیسوں کا احساس ہو رہا تھا، جو اس خاموش بے زبان ہستی کے سینے میں اٹھتی رہی تھیں۔ اس نے ان سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ کوئی خواہش

نہیں کی۔ اسی طرح ان کی خدمت اور دلداری میں لگی رہی۔ وہ تو الٹی احسان مند تھی کہ میاں نے اسے سوکن کے روح فرسا جلاپے سے بچا لیا۔ وہ اسی کے ہیں۔ یہ فخر و مسرت کیا کم تھا؟ لیکن کبھی کبھی انھیں اس کی آنکھوں میں کوئی التجا، کوئی بھوک، کوئی تڑپ نظر آتی ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ مگر وہ اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دیتے کہ کیا آرزو ہے۔ جو ان آنکھوں میں تڑپ رہی ہے۔ اور پھر اس کی آنکھوں کی یہ بھوک اور تڑپ دھیرے دھیرے آسودہ ہونے لگتی۔ انھوں نے خدا کی محبت و عبادت میں اپنے غم کو ڈبو دیا اور بیوی نے انسانوں کی خدمت اور محبت کے مرہم سے اپنے زخم کا علاج کیا۔

لال ٹین کی دھیمی زرد روشنی بیوی کے زرد چہرے پر پڑ رہی تھی۔ گھر میں سب بے کھائے پیئے چپ چاپ اِدھر اُدھر بیٹھے یا لیٹے اونگھ رہے تھے ـــ اور وہ ٹکٹکی لگائے بجھتے ہوئے چراغ کی کی مدھم لو کو دیکھے جا رہے تھے۔

اس کے اندر سے عورت کا کیسا سچا، کتنا سندر روپ نکھر کر سامنے آیا۔ اس کا دل ممتا کا خزانہ لٹاتا۔ اس کے کوئی بچہ نہ تھا مگر وہ سب کی ماں تھی۔ خاندان میں محلے پڑوس میں، گاؤں میں جس کسی کے بچہ ہونے والا ہوتا اور اس کی مدد اور سہارا ڈھونڈتا تو کس ولولے، کس شوق اور جوش سے وہ اس عزت کو قبول کرتی تھی۔ اپنوں اور غیروں کے کتنے چلے اس نے کروائے، کتنے ننھے بچوں کی دن رات خدمت کی۔ زچہ خانے میں ماں اور نانی دادی پیر پھیلا کر سوتیں اور وہ ساری رات ننھے یا ننھی کو گود میں لئے بیٹھی رہتی اور جب مائیں اپنے نوزائدہ بچوں کو گود میں لے کر میکے سے سسرال، یا اسپتال سے گھر واپس جاتیں تو وہ خالی ہاتھ اپنے گھر آجاتی اس وقت اس کے چہرے پر جو حسرت اور بے بسی ہوتی تھی اس کو کوئی بھی نہ سمجھا ـــ کسی نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔

پھر خاندان کے کتنے بچے اس نے پال پوس کر بڑے کئے۔ دس دس پندرہ پندرہ برس تک ان کو کلیجے سے لگا کر دن رات خدمت کرتی، پال پوس کر بڑا کر دیتی۔ پھر کوئی پڑھنے چلا جاتا، کسی کے ماں باپ بلا لیتے، کسی لڑکی کی شادی ہو جاتی ـــ مگر ان کی محبت بدستور باقی

رہتی۔ وہ کہیں ہوں، کہیں رہیں، اپنے اس کے بچے کو "میرے بچے" وہ بڑے فخر سے کہا کرتیں۔ مگر خود اس نے کسی پر احسان نہیں رکھا حق نہیں جتایا۔ سورج کا کام ہے روشنی اور گرمی پہنچانا۔ اس کا کام تھا خدمت کرنا اور محبت کی کرنیں بکھیرنا۔ بس اس کی سیوا اور پریم کا بدلہ صرف ایک لفظ تھا "اماں بی" جس سے ہر بڑا چھوٹا اسے مخاطب کرتا تھا۔ اس بیماری میں بھی وہ اپنے ہر ہر بچے کو یاد کرتی رہیں۔ مگر کبھی شکایت نہیں کی کہ وہ انھیں دیکھنے کیوں نہیں آئے۔ بلکہ ان کی طرف سے عذر کرتیں "کیا کریں نوکری ہے، پڑھائی ہے، بچے ہیں اپنی ہی پریشانیاں ان کو کیا کم ہیں — کتنا وسیع قلب ہے اس دبلے پتلے جسم میں!!

للّو ایک دم سوتے سے چونک اٹھا "اماں بی — اماں بی۔ کیسی ہیں؟" اس نے روتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا "سو جاؤ بیٹا" بھرے گلے سے کہا اور اس چھ برس کے بچے کا بھرا بھرا سیاہ چہرہ دیکھنے لگے۔ ان کی محبت کی آخری برکھا سے یہی ننھی جان سیراب ہوئی تھی۔ للّو کی آواز میں انھیں بیسوں غریب، یتیم، بے سہارا، بچوں کی آوازیں گونجتی سنائی دے رہی تھی جو آج — شاید پھر بے ماں کے ہو جائیں "اماں بی — اماں بی —"

جو بچہ محلے یا گاؤں یا خاندان میں ماں کی آغوش سے محروم ہو جاتا — اور جس کو — غریبی، بیماری یا کسی اور وجہ سے کوئی دوسرا پالنے کی زحمت گوارا نہ کرنا چاہتا، وہ بے تکلف لا کر ان کی گود میں دے دیا جاتا "اسے تو تم ہی پال سکتی ہو" اور وہ اسے یوں چھاتی سے لگاتیں جیسے اسی سعادت کے انتظار میں تو آج تک زندہ تھیں۔ اور پھر کبھی مہینوں، کبھی سالوں یہ بے ماں کا بچہ ان کی آغوش میں پروان چڑھتا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ "ان کے بچے" کو ٹیڑھی نظر سے دیکھ سکے ---------- آج بیس سے لے کر پانچ چھ سال کی عمر تک کے یہ سب بچے۔ اپنے غیر، امیر، غریب، ماں باپ والے، بے ماں باپ کے — کیا یہ سب آج بے ماں کے ہو جائیں گے؟

درد کی ایک تیز لہر ان کے سینے میں اٹھی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا اور وہ پھر پلنگ کے پاس آ بیٹھے۔

جانے کب اور کیسے ـــ وہ خود بھی اس کے ساتھ ان بچوں کی محبت میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال میں دلچسپی لے کر انھیں اپنے دل کا خلا کچھ بھرتا محسوس ہوتا۔ وہ اکثر بھول جاتے کہ یہ بچے ان کے نہیں کسی اور کے ہیں۔ یہ تلخ حقیقت اس وقت یاد آتی جب کوئی بچہ انھیں چھوڑ کر کہیں دور چلا جاتا۔ گذشتہ چند سال سے بڑھاپے کے سنّاٹے میں اکثر ایسے موقع آئے جب گھر میں بقول ان کے "صرف بڈھا بڈھی" رہ گئے۔ ہاں وقت سے پہلے ہی غم نے ان دونوں کو بوڑھا کر دیا تھا۔ جب بچوں کی معصوم صورتیں آنکھوں کو تراوٹ نہ بخشتیں، جب ان کو توتلی باتیں کانوں میں رس نہ گھولتیں۔ جب گھر کا آنگن ویران ہوتا ـــ تو وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا ڈھونڈتے اور ایک دوسرے کے دل کے درد کو محسوس کرتے ـــ وہ اب مشکل سے کبھی ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے۔ بیوی نے مدتوں سے میکہ جانا چھوڑ دیا تھا "انھیں کون دیکھے گا؟" وہ اپنے علاج دوا کیلئے بھی انہیں چھوڑ کر جانا گوارا نہ کرتیں۔ وہ خود کہیں جاتے تو دو چار دن سے زیادہ نہ ٹھیر سکتے۔

"وہ اکیلی ہوں گی۔" بڑھاپے میں میاں بیوی ہی ایک دوسرے کا سچا سہارا ہوتے ہیں، ابھی چند سال سے ان کو اس کا احساس ہوا تھا۔ مگر اس محبت کا اور دوستی کا، جو چپکے ہی چپکے پروان چڑھ گئی تھی، انھیں ابھی دو مہینے پہلے اندازہ ہوا جب وہ سخت بیمار پڑے ہوئے تھے اور ان کی کمزور اور بیمار بیوی ان کی تیمارداری میں یوں لگی رہتیں کہ نہ دن کو دن کہتیں نہ رات کو رات۔ جیسے ستی ہو گئی تھیں۔ اور اٹھتے بیٹھتے بس ایک ہی دعا ان کی زبان اور دل سے نکلتی "الٰہی ان کو صحت دے ـــ ان کی بلا مجھے آجائے۔ یہ بچ جائیں اور اپنے ہاتھوں مجھے قبر کو سونپیں۔"

جانے کیسے وقت یہ دعا مانگی گئی تھی کہ ان کے پلنگ سے اٹھتے ہی بیوی بیمار پڑ گئیں۔ قلب کا سخت دورہ پڑا۔ چھوٹی بہن دور دراز کے بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگ آئی اور تیمارداری اور گھرداری سنبھالی۔ وہ اپنی حیثیت سے زیادہ اس کے علاج پر خرچ کرتے رہے۔ ڈاکٹر، حکیم ہومیوپیتھ بلائے گئے، انجکشن لگے، دوائیں دی گئیں مگر کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بار بار

روکتی رہیں "اتنا خرچ کیوں کر رہے ہو" جس نے عمر بھر خدمت کی ـــ اپنے کو ان کے لئے تج دیا ـــ اب بھی اسے یہ فکر ہے کہ اس پر اتنا خرچ ہو گا تو میاں کو پریشانی اٹھانی پڑے گی ـــ مگر آہ ـــ وہ کیا نہیں کر سکتے اپنی اس چالیس سالہ رفیق کی جان بچانے کے لئے؟ کیا خدا ان کی دعا نہ سنے گا؟ اس نے بیوی کی دعا قبول کر لی؟ کیا وہ سچ مچ اس پر نثار ہو گئیں؟

رات گہری ہو چلی تھی ـــ کتوں کے بھونکنے اور گیدڑوں کے چلانے کی بھیانک آوازیں رات کے سناٹے کو اور مہیب بنا رہی تھیں ـــ آسمان پر ساتویں کا چاند ڈوب چکا تھا ـــ کہکشاں کی دودھیا سڑک اور تابناک ہو گئی تھی ـــ

"میرا لال ـــ میرا چاند ـــ تو آ گیا میرے بچے"

بیوی کی تیز جاندار آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی چونک کر وہ کھڑے ہو گئے۔

"کون آ گیا؟ کیا کہہ رہی ہو؟" وہ اس پر جھکے ـــ بیوی آنکھیں بند کئے ہاتھ سے بستر پر کچھ ٹٹول رہی تھیں۔

"باجی ـــ باجی کون آ گیا؟" بہن نے گھبرا کر کہا۔

"میرا کبن ـــ دیکھو ـــ ابھی ـــ یہ بیٹھا تھا نا یہاں ـــ کبن ـــ"

وہ تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا ہوا بھائی جان ـــ باجی یہ کیا کہہ رہی ہیں" روتے ہوئے بہن نے پوچھا۔

"بی بی تمہاری باجی کا بچہ انھیں لینے آ گیا ہے" ایک چیخ کی طرح ان کے منہ سے نکلا۔

بہن تڑپ کر باجی پر جھکیں، آپا لڑکھڑاتی ہوئی بڑھیں۔

"باجی ـــ باجی" بہن چلا رہی تھی۔

"بی بی ـــ بٹیا ـــ آنکھیں کھولو" آپا بلک رہی تھیں۔

"اماں بی ـــ اماں بی" منظور چلا رہا تھا۔

"اماں ـــ اماں ـــ" للو رو رہا تھا۔

آسمان پر ایک ستارہ ٹوٹا اور تیزی سے روشنی کی ایک لکیر چھوڑتا ہوا فضا میں

کہیں غائب ہو گیا۔

"وہ سدھار گئیں"، بہت آہستہ سے ان کے منہ سے نکلا اور جھک کر اپنے ہاتھ سے انھوں نے بیوی کی شربتی آنکھیں بند کر دیں۔

ماں تا کا سرچشمہ خشک ہو گیا۔ محبت کی تصویر مٹ گئی۔ خدمت کی دیوی نے دم توڑ دیا۔

غیاث احمد گدی

پیاسی چڑیا

آفتاب کب کا غروب ہو چکا تھا۔ اندھیاری جھک آئی' للی واٹسن کی جب آنکھ کھلتی تو سامنے والے املی کے گھنے پیڑ کی آغوش میں چڑیوں کا شور بیدار ہو چکا ہوتا تب ہوا کوئی تیز، مغرور جھونکا اٹھلاتا ہوا آتا اور اس کی کھڑکی کے خوبصورت پردوں کو چھیڑ کر اس کے چہرے کو چومتا گذر جاتا پھر مس للی واٹسن جو گذشتہ رات کی مصروفیت کو بھولے ہوئے ہوتی، املی کے گھنے پیڑ پر اپنی نگاہیں گاڑ دیتی اور سماعت کے پنجڑے کا صدر دروازہ کھول دیتی، جہاں دن بھر کی تھکی ہاری چڑیوں کی لگاتار، مسلسل "چوں چاں، چوں چاں" ہوتی اور پرندے ایک ایک کر کے صدر دروازے سے داخل ہوتے اور پناہ گیر ہوتے۔ رفتہ رفتہ چڑیوں کا شور املی کے منحوس پیڑ سے لپٹ کر سو جاتا۔ تب نیند میں ڈوبی ہوئی مس للی واٹسن کی آنکھیں دیکھتیں کہ اندھیاری جھک آئی اور اس کی ماں مسز واٹسن جو رات کا انتظار سپیدۂ سحر کے نمودار ہوتے ہی کرتی رہتی ہے، ابھی نہیں آئی ہے اور وہ کسلمندی سے بڑی میٹھی، لطیف کسل مندی سے کروٹ بدلتے بدلتے ایک دم سے اوندھی ہو جاتی اور اپنے نازک شاخ گل کی طرح کے جسم کو نرم توشک کے سمندر میں غرق کر چکی ہوتی اور قدرے غنودگی کے عالم میں اپنے سینے، سڈول خوبصورت ننھے ننھے کبوتروں کی طرح کے سینوں پر قدرے بوجھ دے کر فرش پر اپنی انگلیاں ٹکا دیتی اور چاہتی کہ کوئی اس کے جسم پر آہستہ آہستہ دباؤ ڈالے۔ پھر وہ اپنے تصورات میں اپنے خوبصورت گداز جسم کو ایک دم ننگا کر کے دیکھتی اور ایک ذرا غرور، ایک ذرا مسرت سے اس کے لبوں پر مسکراہٹ آتی۔ "ریلی آئی ایم ٹو ریچ۔"

تب ہی کمرے میں اس کی ممی داخل ہوتی اور ایک ذرا مجرمانہ انداز، نگاہ لئے اس کا جائزہ

لیتی اور ایک عجیب سی ہنسی ہنس کر اسے یوں بیدار کرتی گویا وہ جانتی ہی نہیں کہ للی کی رات کی مصروفیات کیا ہیں اور وہ ہر شام بن سور کے پچھلے دروازے سے کہاں جاتی ہے! اس کی ممی پیاری اور بیچاری ممی، ذراسی مکار، ذراسی خود غرض، ذراسی کام چور، پھر للی کو مس جوزیفائن یاد آئی جو اس کی طرف بڑی مہربان نگاہوں سے دیکھتی ہے اور شفقت سے کندھے پر ہاتھ رکھتی ہے اور سرگوشیانہ لب و لہجے میں بولتی ہے کہ "تمھاری ممی ہے ڈارلنگ ......!

پھر وہ چپ ہو جاتی اور اپنے میلے پھٹے ہوئے بدرنگ سنڈل کے پنجے کو دائیں بائیں گھما کر اپنے داہنے ہاتھ سے پرانے پیلے ٹاٹ کے بنے ہوئے خوبصورت جھولوں میں سے ایک کو سامنے کر کے دکھاتے ہنستی ہے اور بھولپن سے کہتی ہے۔ "یہ جھولا تمھیں پسند ہے ......؟"

پھر یہ سن کر للی اسے جواب طلب گہری نگاہوں سے گھورتی ہے، تو پھر وہ دوسرا جھولا، پھر تیسرا جھولا، پھر جوتھا جھولا اس کے سامنے کرتی جاتی ہے اور پوچھتی جاتی ہے — "یہ پسند ہے ...... یہ پسند ہے ...... یہ ...... پسند ہے؟"

پھر للی واٹسن جو خود محسوس کرتی ہے کہ وہ قدرے تیز مزاج کی ہے، اس پر غصہ نہیں ہوتی۔ اور آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتی ہے اور گردن جھکا کر پُر اعتماد لہجے میں کہتی ہے کہ مجھے ...... نہیں، نہیں ...... یہ بھی نہیں!

پھر جوزیفائن بناوٹی خفگی سے پوچھتی ہے۔ "پھر کیا چاہتی ہو؟"

پھر وہ یعنی للی واٹسن جس کی نگاہوں کے سامنے کبھی کبھی کوئی سیاہ، گہرا سیاہ بادل لہرا کر گزر جاتا ہے۔ بڑی ہمت کر کے کہتی ہے — "میں مسز جوزیفائن وہ چاہتی ہوں جو تم کہنا چاہتی ہو اور کہہ نہیں پاتیں ......"

تب یکایک مسز جوزیفائن کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے اور لگاتار ہنسے جاتی ہے "بائی گاڈ بے بی، یہی ایک جھوٹ بات ہے، یہی ایک جھوٹ ......"

"کیا؟" للی اس کے بازو کو پکڑتی ہے اور ذرا خفگی سے بولتی ہے — "کیا جھوٹ ہے —؟"

"یہی کہ میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں، میری پیاری سی گڑیا بے بی، ذرا سی مغرور، ذرا سی تنک مزاج مگر ذرا اچھی سی للی واٹسن بھی وہ سب سننا چاہتی ہے ......"

پھر مسز جوزیفائن اپنے سارے جھولے اپنے ناتواں کندھے پر رکھتے ہوئے اس کے کان کے قریب اپنا منہ لے کر سرگوشی سے کہتی ——— "ذرا سی ہمت کرو، ذرا سی۔ پھر یہ بوڑھی خستہ حال مسز جوزیفائن کچھ نہیں پوچھے گی اور نہ تمھیں کچھ بتانے کی ضرورت ہی پڑے گی۔ کیوں کہ پانی ڈھلان ہی کی طرف بہتا ہے، مائی سویٹی۔"

تب ایک روز وہ اپنی سب کچھ جاننے والی انجانی ماں سے لپٹ کر پوچھ بیٹھتی ہے کہ "ممی ڈارلنگ تم جانتی ہو، میں ہر شام کہاں جاتی ہوں؟"

جواب میں ممی ڈارلنگ گنا ہگار بے گناہوں کی طرح گردن جھکا دیتی ہے اور کچھ نہیں بولتی۔ اپنے انگوٹھے سے کچے فرش پر فرضی لکیریں کھینچنے لگتی ہے۔

پھر اس کی بے زبان ماں کی خاموش گویائی میں ایک پُرشور قہقہہ اُمڈتا ہے اور امڈتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک تیز گرم اور ناقابل برداشت بگولے کی طرح ——— اور اس کی چھاتی پیاس سے پھٹی پڑتی ہے۔ گلے میں یہاں سے وہاں تک ریگستان سلگنے لگا ہے ——— اور لب......

اس نے کہا" ممی میرے لب سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ مجھے ذرا پانی دو۔ ذرا سا پانی ———؟"

اور جواب میں اس ماں پھر وہی پرشور ننگی ہنسی ہنستی ہے اور تڑپتی ہوئی سیال آگ والا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیتی ہے اور اس کے جسم سے ایک اور کپڑا الگ کر کے اسے اجنبی مدہوش سیٹھ کی آغوش میں ڈھکیل دیتی ہے اور یوں جب وہ ایک دم سے الف ننگی ہو جاتی ہے تو ہنستے ہوئے وہ اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیتی ہے اور لپک کر کمرے سے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیتی ہے ——— اور جب، جب وہ اندر چیختی ہے اس کی ممی تب، تب باہر سے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارتی ہے اور زور زور سے قہقہہ لگاتی ہے جیسے بوالہوس گندا گدھ کسی لاش کے آس پاس پھڑ پھڑا رہا ہو۔

اُس دن اس کی پیاری ممی نے اس ادھیڑ عمر کے شراب میں مدہوش روتے ہوئے سیٹھ کو

دیکھکر کہا تھا ـــــ بے بی ڈارلنگ، جانتی ہو، یہ بہت دکھی انسان ہے۔ یہ تمہارے پپا کا دوست ہے۔ اس کا جوان لڑکا موٹر کار کے حادثے میں فوت ہوگیا ہے۔ آج اس غریب پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ بے بی پیاری تم ذرا اس کا غم دور نہیں کر سکتیں۔"

"بے بی ڈارلنگ، دھڑکتے ہوئے دلوں پر ہاتھ رکھو۔ پیاسے حلقوں میں ٹھنڈے پانی کا قطرہ ٹپکاؤ۔ یہی یسوع مسیح نے کہا ہے۔ دھڑکتے ہوئے دلوں پر ہاتھ رکھو...... یہی یسوع مسیح نے کہا ہے۔"

"ممی تم جانتی ہو، اس دن مجھے بھی بہت پیاس لگی تھی اور تم نے ٹھنڈے پانی کے قطرے کی بجائے میرے گلے میں جہنم کی آگ اُنڈیل دی تھی۔"...... پھر مس للی ڈالٹن کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے اور سامنے پڑی ہوئی چائے کی پیالی کو ٹھوکر سے اُڑا کر آگے بڑھ جاتی ہے اور کندھے اُچکا کر لاپروائی سے کہتی ہے ـــــ "جب سے ممی مجھے پیاس ہی نہیں لگتی...... پیاس ہی نہیں لگتی......!"

پھر گہرا سیاہ بادل جو اس کی زندگی کے آگے آگے کھولتے ہوئے سمندر کی طرح سنسناتا رہتا چھٹ جاتا۔ ساری کالونی میں یہاں سے وہاں تک لیمپ پوسٹ روشن ہو جاتے اور مسز جوزیفائن کے کمرے سے وائلن پر "او مائی ڈارلنگ" کی دھن۔ تنے ہوئے تار پر نوٹوں کی طرح پھسلنے لگتی اور ساری فضا، سارا ماحول، سارا عالم خوبصورت نائلون میں ملبوس جھلکتا جھکتا اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا۔ اور جب ہی اس کی ماں خوشی سے تقریباً اچھلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی اور اسے ٹائیلٹ میز سے اٹھاتے ہوئے کہتی کہ کار آگئی ہے، کار آگئی ہے۔ پھر وہ ذرا تیزی سے ذرا لاپروائی سے پیچھے مڑ کر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے سیڑھیاں طے کر کے پچھلے دروازے سے کار کی طرف لپکتی اور مسز جوزیفائن کے وائلن کی دھن اس کے تعاقب میں لرزتی لرزتی کار تک آتے آتے ہواؤں میں کھو جاتی، گم ہو جاتی۔ پھر کار کا ڈرائیور کبھی موٹا بھاری بھرکم عمر دراز، کبھی دبلا پتلا نو عمر، کبھی سیاہ پگڑی اور سرخ بُش شرٹ والا سردار کبھی کوئی خاکی وردی میں ملبوس ڈرائیور ہڑبڑا کر باہر نکلتا اور نہایت ادب سے دروازہ کھول دیتا اور وہ لپک کر کار کے گدّے پر

یوں اُچھل کر بیٹھتی، جیسے ہلکے نرم اور سفید بادلوں کی گود میں گر پڑی ہو۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا، جب وہ نوجوان گہری گہری سیاہ آنکھوں والا مسلمان ڈرائیور ہوتا جو لاپروائی سے پان کھاتا رہتا۔ اور اس کے اس انتظار پر کہ لپک کر اٹھو اور ادب سے نظریں جھکائے دروازہ کھولو گی. بجائے گردن گھما کر پان کی پیک باہر پھینکتا اور پلٹ کر اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتا کہ وہ خلاف عادت، خلاف دستور خود دروازہ کھولتی اور چپکے سے گدّے پر یوں اپنا وجود رکھ دیتی جیسے اس کا اپنا آپ اپنا نہ ہو بلکہ چوری کا ہو۔ بب للی واٹسن جو کسی سے نہیں ڈرتی اور اچھے اچھوں کو ناکوں چنا چبوا چکی ہے، جو شہر کے بڑے بڑے رئیسوں اور افسروں سے پاؤں دبوا چکی ہے، محسوس کرتی کہ اس پان خور مسلمان ڈرائیور کی آنکھوں میں، گہری گہری، سیاہیوں کی طرح جو کس، خنجر کی طرح اٹھی ہوئی نگاہوں میں کوئی ایسی بات ضرور ہے، جو انوکھی ہے، ذرا ڈراؤنی، ذرا چابک سی ہے.. ...... جس کو دیکھتے ہی کوئی شے اس کے احساسات پر سرسرانے لگتی ہے......... اور یہ سرسراہٹ ساری رات طاری رہتی۔ وہ جب جاز کے مست کُن رقص کر رہی ہوتی، کسی مالدار سیٹھ کے ساتھ ڈرنک کر رہی ہوتی، یا پھر اچانک کسی بات پر زوردار قہقہہ لگا رہی ہوتی، وہ خنجر سی اٹھی ہوئی نگاہ اچانک کہیں سے اس کے سر پر جھولنے لگتی اور دفعتاً اس کا نازک سا، نگاہوں کے سمندر میں کنول سا بے گناہ دل اچھل کر اس کے حلق تک آجاتا اور وہ تڑپ جاتی، تب کوئی خریدار اپنے دام وصول کرنے کی غرض سے اسے اپنی طرف کھینچنے لگتا تو وہ ڈری ڈری سی کانپ سی جاتی۔

پھر وہ خریدار اپنے سینے سے چمٹا کر اس کی ٹھڈی اٹھا کر، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وجہ پُوچھ بیٹھتا تو وہ جھلا کر رہ جاتی اور اسے محسوس ہوتا کہ جس آدمی کی عجیب سی نگاہوں سے وہ سہمی رہتی ہے وہ ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور ہے اور وہ اپنی سینڈل کی نوک پر بڑے بڑے افسروں کو رکھتی ہے....

پھر وہ پلنگ پر ننگ دھڑنگ لیٹی اپنے بوائے فرینڈ کے منہ پر لات رسید کرتی اور فرش پر تھوک کر چٹواتی اور گھنٹوں پاؤں دبواتی رہتی اور گولڈن ایگل کے پیگ پر پیگ چڑھاتی اپنے کو بے سُدھ کر دیتی۔ پھر کوئی اس کے جسم کو لاکھ نوچتا بھنبھوڑتا، اسے خبر نہ ہوتی۔

پھر رات کے تیسرے پہر اس کا بوائے فرینڈ زبردستی اٹھا کر کھڑا کر دیتا اور وہ باتھ رُوم سے واپس آتی۔

اور گولڈن ایگل کی تیز جھاگ سطح پر بیٹھ چکی ہوتی تو وہ اپنے آپ کو قدرے ہلکا محسوس کرتی اور ذرا غرور، ذرا تمکنت سے چلتی ہوئی اور کار میں سوئے ہوئے بدمعاش پان خور ڈرائیور کو چیخ کر اٹھاتی۔ اور اپنے رات بھر کے حاصل کئے ہوئے فرینڈ کی طرف غرور سے تکتی اور پان خور مسلمان ڈرائیور ہڑبڑا کر اٹھتا اور اپنے آقا کو سامنے پاکر ذرا گھبرایا گھبرایا مودبانہ سلام کرتا اور آگے بڑھ کر مس للی واٹسن کے لئے دروازہ کھول دیتا اور اپنے آقا کے اشارے پر گاڑی اسٹارٹ کر کے للی کو لے کر ہوا ہو جاتا۔

تب مس للی واٹسن، جس کے بھورے خشک بال پچھلے پہر کی تند ہواؤں کے باعث جھنڈیوں کی طرح پھڑپھڑا رہے ہوتے، مسکراتی اور سامنے لگے گلاس میں جھانک کر دیکھتی، جس میں اس کا خوبصورت معصوم چہرا نکھر نکھرا رہا ہوتا۔ پھر دفعتاً اسے یاد آتا اسی مغرور بے ڈھنگے ڈرائیور نے ایک روز اس سے تمسخر کے انداز میں کہا تھا کہ میم صاحب، ہمارے پاس ایک بلی ہوتا، بہوت موصوم صورت........ ایک دم آپ کا جیسا!

"کیا بولا؟" وہ گرجی تو جلدی سے ڈھٹائی سے بولتا۔

"ایک دم آپ کا مافق مگر وہ سالی چوہا بہوت کھاتا ہے، بہوت......!"

پھر وہ سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھنے کے احساس کو اپنے اوپر طاری کئے گرج کر کہتی۔

"شٹ اپ!"

"شٹ اپ کا مطلب ہم ہیں سمجھتا" وہ لچا بولتا اور اچانک کار کی رفتار دوگنی کر دیتا۔

پھر وہ تیز رفتار کار کے بند شیشوں سے دیکھتی کہ شہر کے جنوبی راستے کا آخری موڑ ختم ہو چکا ہے پھر کار لمبی تنگ اور بدصورت گلی کی گندی دنیا میں داخل ہو جاتی ہے۔ پھر کھلا میدان آتا۔ برگد کا پرانا درخت آتا۔ جس کا پکا چبوترہ اس کی جڑوں کے پھیلنے بڑھنے کے باعث جہاں تہاں سے تڑخ گیا تھا، پھر درخت کے قریب والے گڑھے کے بجھاتے ہوئے پانی کا چھینٹا اڑاتی ہوئی کار ایک تکلیف دہ جھٹکے سے رک جاتی۔ وہ بغیر منہ سے کچھ بولے اٹھ کھڑی ہوتی اور مسلمان ڈرائیور ڈبے سے پان نکال کر اطمینان سے منہ میں رکھتا اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی پھر بغیر ایک لمحہ توقف

کئے پیچھے مڑے تیز تیز چلتی ہوئی اپنے گھر کے ویران اندھیرے میں یوں غرق ہوجاتی کہ اگر رکی تو اس کی پیٹھ پر کوئی تیز سی چابک سٹراپ سے پڑے گی.......

پھر کمرے کے مدھم بیمار بلب کی زرد روشنی میں بڑے سے دریچے کے قریب سوئے ہوئے مائیکل کو دیکھتی، جو ابھی دنیا کے کسی خم سے واقف نہیں، جو غفلت کی نیند میں ڈوبا پتہ نہیں کس خواب زار کی سیر کر رہا ہوگا اور یہ سوچ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی کہ اس کے چھوٹے سے بھولے بھالے بھائی کی ایک گرل فرینڈ بھی ہے یہی گرل فرینڈ جو اگرچہ مائیکل سے کئی سال بڑی ہے مگر پھر بھی مائیکل کے خوابوں کو آراستہ کئے رہتی ہے....... پھر دفعتاً کہیں سے تنہائی کا شدید، شدید ترین احساس اس پر طاری ہوجاتا اور وہ محسوس کرتی کہ وہ جس جگہ کھڑی ہے وہ دراصل بڑا گھنا جنگل، بڑا گہرا تاریک سائیں سائیں کرتی ہوئی ہواؤں والا جنگل ہے۔

پھر وہ پلٹ کر دیکھتی تو سارا کمرہ ویران دکھتا۔ مائیکل گہری نیند میں سویا رہتا۔ مدھم بلب کی بیمار روشنی میں ایک آوارہ پتنگا منڈلا رہا ہوتا اور تب اسے لگتا کہ وہ آدم، آدم زاد نہیں، کوئی اتنی کا بڑا گھنا، گھنا درخت ہے اور گزشتہ رات بھر کے سارے ہنگامے جو ہو چکے ہیں وہ دراصل خود غرضیوں کے پرند ہیں جن کی لگاتار، مسلسل چوں چاں کی آوازیں اس کے وجود سے لپٹ کر سوجاتی ہیں اور....... اور....... وہ ڈراؤنے تن تنہا پیڑ کی طرح اپنے احساسات کو نچواتی رہتی ہے تب ایک ذرا شک، ایک ذرا حسد بھری نگاہوں سے وہ اپنے چھوٹے بھائی مائیکل کو دیکھتی جو خبر نہیں سکون کے کس بلند آسمان پر محو پرواز ہوتا....... پھر اُسے یاد آتا کہ ادھر کچھ دنوں سے اس کے چھوٹے بھائی مائیکل کی آنکھوں میں کوئی سوال مسلسل سلگتا رہتا ہے اس کی بھوری معصوم آنکھیں کبھی کبھی سوال میں بدل جاتی ہیں اور چلتے چلتے اس کے دل کے دامن کو تھام لیتی ہیں۔

کیا مائیکل وہی سب جاننا چاہتا ہے۔ پھر وہ فرط محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی اور جھک کر آہستہ سے اس کی پیشانی چوم لیتی.......

(۲)

جب مسز جوزیفائن کے دروازے پر ہلکے سے تین چار بار دستک ہوئی تو وہ جو دیر سے سنگھے

کی بجائے فرائی پین سے لوہے کے چھوٹے سے چولھے کا دھواں اڑانے میں مشغول تھی ایک ذرا گردن موڑ کر بھیگی آنکھوں سے اُس نے دروازے کی طرف دیکھا اور "کم اِن" بول کر پھر کوئلے کا دھواں اڑانے لگی۔

پھر جب ذرا دیر بعد دھواں اڑ گیا اور شعلوں کی سُرخ زبان تھرتھرانے لگی تو اس نے دیکھا کہ کمرے کی جنوبی دیوار سے لگی جو اجاڑ صورت لڑکی کھڑی ہے وہ کوئی اور نہیں ہے، للی واٹسن ہے۔ جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور کسی کی پروا نہیں کرتی۔

"ہائی سویٹی .... مائی ڈارلنگ .... آؤ آؤ میرے قریب بیٹھو۔"

اور جب مس للی اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی تو وہ ذرا کی ذرا آنے کی معذرت کرکے چولھے کے پاس گئی اور ایک پانی سے بھری ہوئی کیتلی چولھے پر چڑھا کر واپس آئی اور للی کی پیشانی چوم کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"تمھیں پتہ ہے بے بی تم تین دن کے بعد کالونی لوٹی ہو۔ اور ان تین دنوں میں جانتی ہو کیا خاک اڑ رہی ہے؟ کیا ہنگامے ہوئے ہیں؟؟ تمھاری ممی جو تمھیں سونے کی چڑیا سمجھتی ہے۔ بیسیوں بار بیہوش ہوئی ہے اور پاگلوں کی طرح کالونی کی نالیوں اور گندگی کے ٹب میں تمھیں ڈھونڈتی پھری ہے، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس کی للی بیٹی ایسی ہی جگہ کھوئی ہے۔"

پھر للی کی خاموش اُجاڑ صورت، تباہ حال دیکھکر مسز جوزیفائن چپ ہو جاتی ہے اور بڑی سرگوشیوں میں پیار سے کہتی ہے "کین آئی ہلپ یُو ڈارلنگ؟"

"نو مسز جوزیفائن، تھینک یو .... کیونکہ میں بذات خود ....؟" پھر للی واٹسن نے چائے کی ایک پیالی پیتے ہوئے بتایا کہ اس پان خور مغرور مسلمان ڈرائیور نے حسب دستور تمکنت سے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ چپ چاپ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور کار ٹیڑھے میڑھے راستوں کو طے کرکے ایک جھٹکے سے صدر راستے پر آچکی تو اس نے آہستہ سے متین لہجے میں کہا۔

"آج ہم تمھارا سیٹھ کے نہیں جائے گا ...."

ڈرائیور نے پلٹ کر ایک نظر دیکھا اور قبل اس کے کہ وہ کوئی سوال کرے، للی نے طمانیت سے جواب دیا "آج ہم تمھارا گھر جائے گا۔؟"

دفعتاً کار کو زور سے بریک لگی اور مس تلی والٹسن اگلی سیٹ سے ٹکراتے بچی۔ ڈرائیور نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز سے رُک رُک کر کہا۔

"مگر...... مگر ہمارے پاس پیسہ نہیں!"

پھر میں مسز جوزیفائن بہت زور سے قہقہہ لگا کر ہنسی ۔۔۔ "کیونکہ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ سچائی جو کچھ دکھائی دیتی ہے وہی نہیں ہے بلکہ اس سچائی کے نیچے بھی ایک حقیقت ہے جو بڑی کھری ہے!"

مسز جوزیفائن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور اس نے استعجاب سے چھوٹی سی کمزور سی کم عمر تلی کو یوں دیکھا گویا وہ کسی بڑے اونچے توی ہیکل پہاڑ کے قریب کھڑی ہے۔ پھر اس نے پلنگ کی چادر درست کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "لیکن بے بی، میں سمجھی نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں بھی نہیں سمجھ پائی تھی مسز جوزیفائن۔ کیونکہ میں نے بھی اس سے پہلے کبھی وہ منظر نہیں دیکھا تھا۔ ذرا توقف کے بعد اس نے کہا کہ جب پیچدار گلیوں اور چھوٹے چھوٹے کھپریوش مکانوں والے محلے سے گزرتی ہوئی کار ایک بے حد تنگ، بے حد غلیظ گلی کے موڑ پر رُکی تو بدبو کا ایک بھبکا اس کی ناک میں گھس گیا جس کے باعث اس کے احساسات میں گندگی پھیل گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اس کا بازو پکڑ کر جلدی جلدی دو تین چھوٹی بڑی گلیوں کو طے کر کے ایک ٹاٹ کا پردہ لگے دروازہ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ذرا نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور جلدی سے یوں تلی کو لئے دیئے پردے کے اندر غڑاپ سے گھس گیا جیسے کوئی بھاری پتھر پانی کی سطح پر گر کر ڈوب جائے۔

برآمدے میں تلی کو کھڑی کر کے وہ مسلمان ڈرائیور، جس کا نام عبدل تھا اندر کوٹھری میں گیا کسی سے سرگوشیوں میں باتیں کیں۔ پرانی لالٹین جو بھبک بھبک کر جلنے کے باعث دھواں اگل رہی تھی اسکی چمنی کو صاف کیا۔ بیچوں بیچ لگی موٹی رسّی پر ایک میلی چادر ڈال کر کمرے کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ۔۔۔ تب اس کا ہاتھ پکڑ کر چوروں کی طرح اسے اندر کمرے میں ایک جھلنگ چارپائی پر بٹھا دیا اور "ابھی ابھی آیا" کہہ کر کمرے کے باہر نکل گیا۔

لالٹین کی مدھم سُرخ روشنی میں للی واٹسن نے دیکھا وہ چھوٹا سا کمرہ ہندوستانی فلم اسٹاروں کی پھٹی تصویروں سے بے ڈھنگے پن سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس میں سیلن ہے اور ایک عجیب طرح کی ناقابل برداشت بُو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جب ہی کمرے کے دوسرے حصے سے کسی کمزور آدمی کے کراہنے کی آواز بھی آئی اور للی دفعتاً گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے دل میں آیا کہ بھاگ جائے......

لیکن اس نے اپنے دل کو ڈھارس دی اور بڑے حوصلے سے اور ہمت کر کے چادر کے اس طرف والے حصے کی طرف جھانک کر دیکھا جہاں ایک چارپائی پر بے حد گندہ بستر بچھا ہوا ہے اور اس پر ایک ہڈیوں کا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔ یہ عبدل کی بیوی تھی جو بہت بیمار تھی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس کے سینے سے چمٹا ہوا ایک نحیف سا بچہ تھا، جو رہ رہ کر کلبلاتا تھا۔ اس کے پیروں سے لگے دو کم عمر بچے بے خبر سوئے ہوئے تھے۔

عبدل کی بیوی پانی مانگ رہی تھی۔

مس للی واٹسن دنگ تھی، ایسا لگتا تھا جیسے وہ، وہ نہیں ہے کوئی اور ہے۔ چنانچہ للی نے گردن ٹوٹی صراحی سے گلاس میں پانی اُنڈیلا اور ایک نامعلوم جذبے کے زیر اثر عبدل کی بیوی کی گردن میں اپنا بازو حائل کر دیا اور ذرا سا زور دے کر اس کی گردن کو اٹھا کر گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا اور عبدل کی بیمار بیوی برسوں کی پیاسی چڑیا کی طرح غٹ غٹ پانی پینے لگی......

"تب مسز جوزیفائن......" للی نے اپنے آپ کو مسز جوزیفائن کے بستر پر ڈال دیا۔ ایک طویل جمائی لے کر آنکھیں بند کر لیں اور ایک ایسی دنیا میں چلی گئی جہاں دور دور تک تاحد نگاہ سبزہ زار ہی سبزہ زار تھا، وسیع سفید براق بادلوں میں ملبوس وسیع آسمان، محبت کی ناآسودہ لبوں کو چومتی ہوئی ہوائیں، دل اور دل کی مقدس دھڑکنیں، اور خدا...... اور خدا...... اور خدا......!

"تب مسز جوزیفائن......" اس نے آنکھیں کھول دیں —— "میں نے یوں محسوس کیا کہ یہ پانی جو گھونٹ گھونٹ کر کے عبدل کی بیماریوں کے خشک حلق میں دھاگے میں سچے موتی کی طرح اتر رہا ہے، اس سے دراصل میری اپنی پیاس بجھ رہی ہے......"

"للی!" مسز جوزیفائن نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور لپک اس کی پیشانی چوم لی۔

"—— پھر، پھر کیا ہوا —— ؟"

پھر عبدل کی بیوی نے کہا" میں کئی مہینے سے بیمار ہوں اور اسی حالت میں اپنا جسم بچواتی ہوں .... میرا شوہر مجھے کھانے کو دیتا ہے، کپڑے دیتا ہے اور سود خور بنیے کی طرح اس کی قیمت وصول کرنے میں ذرا دریغ نہیں کرتا، میں لاکھ کہتی ہوں، میرے بدن میں، میرے جوڑ جوڑ میں درد ہے، میرا دل رہ رہ کر ڈوبنے لگتا ہے۔ مگر وہ نہیں مانتا، اس کی آنکھیں اس وقت اور بھی سُرخ ہو اٹھتی ہیں، چڑھ جاتی ہیں، چہرہ تن جاتا ہے اور اس کے بازوؤں میں اور زور آجاتا ہے ....

...... اور اس وقت میں سوچتی ہوں کہ دام تو ہر خریدار کو وصول کرنے کا حق ہے اور یہ سوچ کر چپ ہو جاتی ہوں اور بعد ازاں کھری چارپائی پر یوں نڈھال ہو کر گر جاتی ہوں جیسے کسی کبوتر کو بڑی زور کا غلیل کا ڈھیلا لگا ہو اور ویران دھرتی پر پیاسا ہانپ رہا ہو۔ ہانپے جا رہا ہو......"

پھر لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ اس کی طرف دیکھتی ہے اور ذرا تعجب اور ذرا خوف سے بولتی ہے۔ "تم کون ہو۔؟"

پھر مس للی والٹسن بتاتی ہے کہ وہ کون ہے اور کیوں یہاں لائی گئی ہے۔ جسے سن کر عبدل کی بیوی اٹھ بیٹھی ہے اور مدھم روشنی میں ڈوبتی ہوئی مگر تیز آنکھوں سے دیکھتی ہے اور اس کی پیشانی پر ملائمیت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکراتی ہے۔ "تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم ایسی نہیں لگتیں۔ تم پیاسوں کو پانی......"

اس نے للی کی ٹھوڑی پکڑ لی اور اُس کا چہرہ روشنی کی طرف کرتے ہوئے بولی ـــــ
"تم تو مجھے وہ لگتی ہو جو سات برس قبل اس کوٹھری میں لائی گئی تھی، شرمائی شرمائی سی، تصورات میں کھوئی کھوئی سی، ذرا خوف زدہ، ذرا حوصلہ مند، ذرا سی مسکراتی ہوئی، پچھلی زندگی کا غم اور آئندہ کے لہلہاتے مرغزار لئے......"

پھر مسز جنڈ لفائن، میں وہاں سے بھاگنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں غلط جگہ آگئی ہوں اور دفعتاً میری کئی برس کی سوئی ہوئی پیاس جاگنے لگی۔ یقیناً غلط جگہ ہے، کیونکہ یہاں عبدل کی بیوی جیسی عورت رہتی ہے جو سمجھتی ہے کہ وہ للی والٹسن جوانی اور اپنی خود غرض ماں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جگہ جگہ کنواں کھودتی رہتی ہے اور اس کی تہہ تک پہنچ کر آخری بوند بھی کھینچ لینا چاہتی ہے

بڑی نیک لڑکی ہے اور اپنے ہاتھوں میں ٹھنڈے پانی سے بھری صراحیاں لئے پھرتی ہے۔

پھر میں نے اس نادان کو بتایا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھ رہی ہے۔ میں ایک معمولی جسم فروش ہوں جس نے اپنے حالات کی یک رنگی، اپنے بھائی کی آنکھوں کے مسلسل سوال سے گھبرا کر فرار حاصل کیا ہے اور اب اس کے شوہر عبدل ڈرائیور کی آنکھوں میں چبھتی ہوئی خنجر کی تیز دھار کو دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ مجھے کہاں کہاں سے اور کس کس طرح قتل کرتی ہے۔

اس نے کہا —— "میں سمجھ نہیں پائی، تم کیا کہہ رہی ہو۔؟"

میں نے کہا —— "تم سمجھ بھی نہ پاؤگی۔"

اور یہ کہہ کر جب میں جانے لگی تو اس نے لپک کر میرا دامن تھام لیا۔ "نہیں، نہیں آج مت جاؤ۔ آج میرا دل رہ رہ کے ڈوبنے لگتا ہے۔ مجھے آرام دو......"

چنانچہ مس للی واٹسن نے تین دنوں تک اسے آرام دیا۔ اس کے شوہر کے آگے ایک کھلی ہوئی دری کی طرح بچھ گئی۔ اس کے تینوں چھوٹے چھوٹے بچوں کو نہلایا، اس کے کپڑے صاف کئے، انھیں اپنے ہاتھوں سے کھلایا اور اس کے کمرے کی سیلن، تاریکی اور برسوں کی گھٹن کو اپنی روح میں اتارتی رہی۔

اور اس کا شوہر شرمسار نظر نیچی کئے للی کی پکی پکائی روٹیاں کھاتا اور نگاہ جھکائے کپڑے تبدیل کرتا اور مجرموں کی طرح گردن جھکائے کمرے سے یوں نکل جاتا جیسے خود اس کی آنکھوں میں تنی ہوئی چابک للی کی آنکھوں میں آگئی ہو۔

"پھر؟" مسز جوزیفائن نے یوں کہا جیسے یہ سب خواب کی باتیں ہوں۔

"آج دوپہر میں، جب سورج ابھی سلگ رہا تھا، اس کی بیوی مرگئی......"

"ہائیں!"

"ہاں، مسز جوزیفائن۔ تینوں بچے چیختے چیختے رہے، اس کا شوہر سرہانے کھڑا رو تا رہا اس کی آنکھیں میرے چہرے پر لگی رہیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ مجھے آرام دو، آرام دو.... .... آرام دو......"

اور میں نے پتہ نہیں کس بے اختیار جذبے کے تحت جھک کر گلاب کی دونوں پنکھڑیوں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں اور میری آنکھوں سے دو گرم گرم پانی کے قطرے تڑپ کر اس کے خشک 'غم رسیدہ' رخساروں پر پھیل گئے......

مسز جوزیفائن کے چھوٹے سے کمرے میں گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ کئی صدیاں گزر گئیں۔ کیتلی کا سنسناتا ہوا پانی بھی چپ ہوگیا۔ نہ لّلی نے، نہ مسز جوزیفائن نے۔ کسی نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ دونوں گویا ایک تارِ عنکبوت پر چلتے چلتے رک گئی ہوں۔

مس لّلی واٹسن نے اپنی بکھری ہوئی زلف سمیٹ کر سنہری ہیئر پن سے یکجا کرتے ہوئے کہا۔
"تب دفعتاً مسز جوزیفائن مجھے محسوس ہوا کہ میں جس کمرے ہوں وہ بہت گرم ہے، بہت تاریک ہے...... اور دفعتاً مجھے پیاس لگی اور میں آہستہ سے غیر ارادی طور پر کمرے سے نکل آئی۔ میں گلی گلی چلتی جاتی اور پیاس کی شدّت سے میری چھاتی پھٹی جاتی تھی اور میرے قدموں میں چلنے کی طاقت سن ہوئی جارہی تھی۔ چنانچہ جب چاروں طرف سنّاٹا تھا، دھوپ سخت تھی اور ساری دنیا تنہائی اور شدید دھوپ میں سلگ رہی تھی، میں ایک مکان کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

سامنے میونسپلٹی کا نل سنسان پڑا تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ لپک کر جائے اور نل کھول کر جی بھر کے پانی پیئے، جی بھر کے مگر اس کے قدم ہی نہ اٹھے اور وہ چپ چاپ آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔

تب مسز جوزیفائن میں نے کیا دیکھا کہ میں کیا بتاؤں، میں پیاس بھول گئی کیونکہ نل اچھی طرح سے بند نہ ہونے کے سبب ٹپک رہا تھا اور وہیں کتے کا ایک چھوٹا سا بچہ دونوں ٹانگیں اٹھا کر نل کی دیوار سے لگائے، چہرے کو اوپر کیے کھڑا تھا اور جیسے ہی نل ٹپک کر پانی کا قطرہ گرتا وہ پلہ اپنا چھوٹا سا منہ کھول دیتا اور اس کے حلق میں اُتر جاتا۔

پھر مس لّلی واٹسن خاموش دیکھتی رہی اور معصوم پلے کے منہ میں پانی اترتا رہا قطرہ قطرہ قطرہ، جیسے دھاگے میں سچا موتی اتر رہا ہو۔ قطرہ قطرہ......

شوکت صدیقی

چاند گہن کی رات

خوشبو رفتہ رفتہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

رات کے پچھلے پہر کا سناٹا اور ہر طرف پھیلی ہوئی تاریکی، کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ابھی اُٹھ کر گیا ہے۔ اس آسیب زدہ کمرے کے اندر نیند تو کیا آتی، البتہ سر میں درد ہونے لگا تھا۔ فرقان کچھ دیر تک تو بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اُس نے آنکھیں کھولدیں اور اٹھکر بستر پر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوتا ہے آج بھی شب بیداری کرنا پڑے گی۔ کل ٹرین میں رات بھر اس نئی نویلی دُلہن کے عاشق مزاج شوہر نے وہ دھما چوکڑی مچائی کہ لمحہ بھر آنکھ نہ لگ سکی۔ مری پہنچنے سے پہلے ہی اس نے ہنی مون منانے کا ریہرسل شروع کر دیا تھا۔ سوچا تھا کہ آج لمبی تان کر سوؤں گا۔ یہ تو بوڑھا کرنل مل گیا جس نے آدھی رات تک اپنی باتوں سے بور کیا اور رات بسر کرنے کے لئے یہ کمرہ دیا جس میں ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی، سینٹ کی خوشبو، پاؤڈر کی خوشبو، کریم کی خوشبو، زلف عنبریں، پیرہن کی خوشبو، جسم نازنین کی خوشبو! سوچتے سوچتے وہ چونک پڑا اس مہکتے ہوئے بستر نے تو خواہ مخواہ اس قدر رومینٹک بنا دیا۔

آخر اس نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کر دیا۔ بستر پر ایک گہری نظر ڈالی۔ جھلکتا ہوا نرم نرم ریشمی لحاف، سرہانے باسی پھولوں کا گجرا، تکیہ پر خوبصورت رنگوں سے کڑھا ہوا یہ مصرعہ

یہی ہے ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

فرقان مسکرانے لگا تو گویا یہ ہے آپ کے شباب و خواب کی دنیا، جس میں میرے لئے نیند کا کوئی سامان نہیں، بہر حال یہ تو طے ہو گیا کہ یہ کرنل صاحب کی صاحبزادی کا کمرہ ہے جو اس وقت

سینی ٹوریم میں اپنی بیمار ماں کے پاس موجود ہوں گی لیکن لڑکی ہے نفاست پسند۔ بڑا آرٹسٹک ذوق پایا ہے مگر جو لڑکیاں تیز خوشبو پسند کرتی ہیں اگر ان کی نفسیات کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوتا تو مزہ آجاتا۔ اس وقت اس کو اپنا انٹلکچوئیل ٹائپ دوست یاد آگیا جس نے ڈان ژدان قسم کی ڈاڑھی اس لئے رکھ لی تھی کہ لڑکیوں کے لبوں کا بوسہ لیتے وقت جب ڈاڑھی کے بال گردن اور رخساروں پر آہستہ آہستہ چبھتے ہیں تو اُن کی ساری جنسی حسیات بیدار ہوجاتی ہیں۔ اس قسم کے بہت سے مجرب نسخے اس کو یاد تھے۔ وہ ہمیشہ اسی موضوع پر بات کرنے کے موڈ میں رہتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ایک ایسی عورت کو اغوا کرنے کے اقدام میں پکڑا گیا جو کئی بار نوجوانوں کو اغوا کرچکی تھی۔ افسوس کہ اس ماہر نفسیات سے تھوڑا بہت ہی فیض حاصل کرلیا ہوتا تو آج کی رات کام آتا۔

اب وہ بستر سے اُتر کر نیچے آگیا تھا اور آہستہ آہستہ فرش پر ٹہل رہا تھا، رات دبے قدموں گزرتی جارہی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے دریچے کے دونوں پٹ کھول دیئے اور اس سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ باہر سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا، خاموشی تھی اور گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا یہاں بھی چین نہ ملا۔ جسم کو کچھ خنکی بھی محسوس ہوئی۔ اس نے کھڑکی بند کردی اور میز کے قریب کرسی پر جاکر بیٹھ گیا۔ میز کے ایک کونے پر ایک تصویر رکھی تھی، وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ اچھا تو یہ آپ ہیں تصویر تو خوبصورت ہے خوبصورت نہ ہوتی تو اس طرح سجا کر کیوں رکھی جاتی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے وہ میز پر بکھری ہوئی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اچانک ایک کتاب کے اندر سے ایک لفافہ نکل کر سامنے آگیا، اس کے ساتھ ہی ہلکی سی مہک بھی اُبھری۔ لفافہ کو ناک کے قریب لے جاکر سونگھا۔ کئی بار سونگھا۔ لفافہ کے اندر سے ایک خط نکالا۔ کسی کا خط پڑھنا بری بات ہے لیکن کسی دوشیزہ کے کمرے میں اس طرح خانہ تلاشی لینا؟ خانہ تلاشی تو بعد میں ہوگی فی الحال اس نے خط پڑھنا شروع کردیا۔ خط پڑھتے پڑھتے اس کو بے ساختہ ہنسی آگئی، اچھا تو صاحبزادی عشق بھی فرماتی ہیں۔ مگر یہ شخص جس کا نام ریاض ہے سخت بزدل اور نکما معلوم ہوتا ہے، اس نے اظہار محبت کم کیا تھا یا سننگ زیادہ کی تھی، خط میں جگہ جگہ اشعار کی بھرمار تھی، ان شاعروں کا سوز عشق تھا جن کی تمام زندگی فراق محبوب میں کٹی تھی اور جن کی طرف کسی مہ لقا نے کبھی التفات نہ کیا تھا

پھر تو اس نے باقاعدہ خانہ تلاشی شروع کردی۔ پہلے اس نے میز کا ایک خانہ کھولا اس میں کچھ کاغذات تھے، کچھ خطوط تھے۔ فرقان نے کئی خطوط نکال کر پڑھے ان میں بھی کئی محبت نامے تھے کچھ کامیاب عاشق تھے، کچھ ناکام تھے۔ انھوں نے اس کے حسن کی قصیدہ خوانی کی تھی، جو ناکام تھے انھوں نے رسوا کردینے کی دھمکی دی تھی، کچھ خودکشی پر آمادہ تھے، کچھ صحرانوردی کا ارادہ کرچکے تھے۔ اس نے سوچا لڑکی تو خاصی فلرٹ معلوم ہوتی ہے اچھے خاصے اسکنڈل اکٹھے کر رکھے ہیں۔ اُس سے تو ضرور ملنا چاہیئے۔

میز کا دوسرا خانہ کھولا، اس میں چوڑیاں، سنگھار کا سامان اور کچھ ایسی اشیا تھیں جن پر نامحرموں کے لئے پوشیدہ کا لیبل لگا رہتا ہے۔ تیسرا خانہ کھولتے ہی ایک نیم برہنہ قوی ہیکل حبشی کی تصویر سامنے آگئی۔ تصویر کو کسی امریکی رسالے سے کاٹ کر نکالا گیا تھا۔ اس تصویر کی یہاں کیا تُک؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن آنکھوں میں نیند کا خمار آگیا تھا۔ فرقان نے میز پر رکھی ہوئی تصویر کو نظر بھر کر دیکھا، انگڑائی لی اور مسکرانے لگا۔ اچھا تو محترمہ پھر خدا حافظ۔ اور وہ بستر پر جاکر دراز ہوگیا۔

مگر نیند نہ آئی۔ اس نے پھر کمرے میں روشنی کی۔ میز پر سے تصویر اٹھا کر دیر تک خوابناک نظروں سے دیکھتا رہا۔ باری باری میز کے تینوں خانے کھول کر دیکھے۔ آخری خانہ میں پھر وہی سیاہ فام حبشی کی تصویر تھی۔ وہی الجھن، وہی کرید، رات نے اپنا تھوڑا سا سفر اور طے کرلیا۔ فرقان کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ اس دفعہ جب وہ بستر پر گیا تو آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن جب وہ صبح کی چائے پی رہا تھا تو ایکا ایکی برابر والے کمرے میں کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔ یہ بوڑھے کرنل کی لڑکی سیما تھی جو نوکر پر برس رہی تھی۔

”افوہ، کبئی یہ کیا مصیبت ہے رات کو میرے کمرے میں کون آیا تھا کس نے اس کو وہاں جانے دیا۔ تم نے منع کیوں نہیں کیا۔ بدتمیز کہیں کا، سارا سامان الٹ پلٹ کر رکھدیا۔ ذرا بستر کی حالت تو دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے رات بھر کشتی لڑی گئی ہے۔ بے غیرت، بے حیا!“

زور زور سے چیخنے کے باعث اس کی آواز بھرّا گئی۔ پھر وہ رونے کے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ فرقان چپ چاپ بیٹھا مسکراتا رہا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اس وقت یہاں آجائے تو مزہ آجائے مگر وہ اُس طرف نہ آئی۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر وہ لائبریری کی طرف چل دیا۔ بوڑھا کرنل وہاں موجود تھا۔ اس وقت وہ کرسی پہ آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے برابر ہی سیما بیٹھی اخبار پڑھ کر سنا رہی تھی۔

قدموں کی آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور اس سے پوچھنے لگا۔

"چائے پی لی تم نے؟"

"جی ہاں!"

وہ کہنے لگا۔ "بھئی معاف کرنا میں بہت تڑکے ناشتہ کر لیتا ہوں۔ میں نے فیضو کو بھیجا تھا تم اس وقت سو رہے تھے۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی تم کو رات کے وقت"

فرقان نے دبی زبان سے جواب دیا۔ "جی نہیں۔ نیند ذرا دیر سے آئی تھی"

"اوہو، سردی لگی ہو گی"

"جی نہیں بستر تو بڑا گرم تھا" اس دفعہ فرقان نے بدمعاشی سے سیما کی جانب دیکھا۔ اس نے جھٹ سے اخبار اپنے چہرے کے سامنے کر لیا۔

ذرا دیر تک کرنل سے باتیں کرنے کے بعد وہ اپنے ہوٹل چلا آیا۔ کچھ ضروری خط لکھنا تھے ان سے فارغ ہونے کے بعد اس نے دوپہر کا کھانا کھایا اور پڑھ کر سو گیا۔ سہ پہر تک گہری نیند میں پڑا سوتا رہا جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا پھیل چکا تھا۔

شام کو بوڑھے کرنل کے پاس گیا مگر وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ وہ دیر تک کمرے میں تنہا بیٹھا رہا۔ کرنل کا مکان ایک اجاڑ سے ٹیلے پر تھا۔ دور دور پر اکا دکا دو چار بنگلے تھے۔ سر شام ہی وہاں سناٹا پڑ گیا تھا۔ اس سناٹے میں کبھی کبھی سیما کی آواز سنائی دے جاتی، وہ نوکر کو ہدایت کر رہی تھی۔ کئی بار اٹھ کر وہ دروازے تک بھی گیا مگر وہ نظر نہ آئی۔ بے چین ہو کر اس نے ٹہلنا شروع کر دیا۔

ہر طرف رات کی ویرانی پھیلتی جا رہی تھی۔ ابھی تک بوڑھا کرنل واپس نہیں لوٹا تھا۔ فرقان ٹہلتا ہوا کمرے سے باہر گیا۔ گھر میں بالکل خاموشی تھی۔ باورچی خانے میں روشنی ہو رہی تھی، وہ اسی طرف چل دیا۔ راستہ میں سیما کا کمرہ پڑتا تھا۔ جب وہ اس کے سامنے پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا وہ اس وقت پیٹھ موڑے، میز کے سامنے بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

فرقان لحظہ بھر تک وہاں کھڑا رہا۔ پھر ہمت کر کے کمرے کے اندر چلا گیا۔ قدموں کی چاپ سُنکر سیما نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا، وہ معذرت کرنے کے سے انداز میں کہنے لگا۔

"معاف کیجئے گا اس بے جا مداخلت کو۔ کیا آپ یہ بتا سکتی ہیں کہ کرنل صاحب کب تک واپس لوٹیں گے؟"

سیما نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا" اب تو ان کو آجانا چاہیئے، کہہ تو یہی گئے تھے"

تھوڑی دیر تک کمرے کے اندر خاموشی چھائی رہی۔ فرقان نے نظر بھر کر سیما کو دیکھا۔ لڑکی تو یار واقعی بڑی زوردار ہے کہیں سے بھی فلرٹ وکرٹ معلوم نہیں ہوتی۔ گٹ اَپ بھی اچھا ہے مگر یہ خواہ مخواہ کی خاموشی! اس سے تو بہتر ہے کہ وہ کمرے سے باہر چلا جائے مگر وہ باہر نہ گیا اور جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔

"کل رات ملازم کی حماقت سے میں آپ کے کمرے میں سو گیا تھا۔ مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے"

اس روز وہ اپنے شائستہ ہونے کا پورا پورا ثبوت مہیا کرنے پر تلا ہوا تھا لیکن وہ اس کی بات نظر انداز کر گئی۔ کہنے لگی۔ "ہمارا یہ ملازم بڑا گھامڑ ہے۔ کیا کیا جائے۔ دوسرا کوئی قاعدے کا آدمی ہی نہیں ملتا"

فرقان ابھی اس سے کچھ اور باتیں کرتا۔ اسی اثنا میں، باہر بجری والے راستہ پر بوڑھے کرنل کی کھانسی کی آواز سُنائی دی۔ وہ وہاں سے ڈرائنگ روم میں آگیا۔

اس روز رات کا کھانا بھی اس نے کرنل کے ساتھ کھایا اور رات گئے تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ آج کی گفتگو سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ بوڑھے کرنل کی زندگی قابل رحم حد تک بے کیف ہے۔ فوج سے پنشن ملے اس کو بہت مدت ہو گئی تھی۔ تمام پرانے ملنے جلنے والے یا تو مر کھپ گئے تھے یا اسی کی طرح زندگی کے ہنگاموں سے الگ تھلگ، کسی ویران مقام پر، آبادی سے دور تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس کو ایک شخص کی ضرورت تھی جو تنہائی کا احساس زائل کر سکے، اس کی باتوں کو سُنے، اُن میں دلچسپی کا اظہار کرے۔ یہ باتیں، جو اس کے ماضی کی صدائے بازگشت تھیں۔ راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریاں، جن کو کرید کر وہ اپنی لاش کی طرح سرد اور ٹھٹھری ہوئی زندگی میں تھوڑی بہت ہل چل پیدا کر لیتا تھا۔ اپنی عمر کے ہر آدمی کی طرح اس کے پاس صرف یادوں کا سرمایہ رہ گیا تھا۔

واپسی پر اس کے دل میں جہاں بوڑھے کرنل کے لئے ہمدردی کا جذبہ تھا، وہیں یہ احساس بھی تھا کہ سیما قطعی نارمل لڑکی ہے۔ گزشتہ شب اس نے جو بہت سی بے تکی باتیں سوچی تھیں، وہ قطعی بے سرو پا تھیں۔

اب اس کا یہ معمول ہوگیا کہ روزانہ شام کو وہ بوڑھے کرنل کے پاس جاتا۔ رات کا کھانا وہیں کھاتا اور رات گئے تک اس کی باتیں سنا کرتا۔ یہ باتیں بڑی دلچسپ تھیں، بڑی ہنگامہ پرور تھیں۔ جوانی میں کرنل نے بڑے بڑے کھیل کھیلے تھے۔ باتوں کی رَو میں وہ اکثر ایسی باتیں بھی کر جاتا تھا۔ جن کو کہنے کے بعد بار بار شرمندگی میں بھی ایک مسرت ہوتی، ایک ولولہ ہوتا۔

چند ہی روز میں فرقان کو بوڑھے کرنل کی بہت سی عادتوں کا پتہ چل گیا۔ باتیں کرتے کرتے وہ جوش میں آجاتا تو جو چیز سامنے رکھی ہوتی۔ اس کو اٹھا کر فرش پر دے مارتا اور پھر دیر تک پشیمان سا بیٹھا رہتا۔ اپنی اس فوجی عادت کے باعث اس نے نہ جانے کتنی پلیٹیں اور گلاس شہید کر دیئے تھے، اس کی باتوں میں یہ جوش ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتا تھا جب وہ دیولالی کا ذکر کرتا تھا۔ اس کیمپ میں اس نے بڑے بڑے ہنگامے کئے تھے تین شورہ پشت نائیکوں سے رات بھر دلیل کرائی تھی اور ایک خر دماغ سارجنٹ کا جبڑہ توڑ دیا تھا اور اپنے آفیسر کمانڈنگ کو جو ایک برطانوی میجر تھا، اس بات پر ڈوئیل لڑنے کا چیلنج دیا کہ اس کی بیوی سے اس کا معاملہ کچھ عین غین ہوگیا تھا۔ ڈوئیل کی تو بہر صورت نوبت نہ آئی۔ البتہ میجر نے اس کا ریکارڈ خراب کر دیا اور پانچ سال تک کے لئے پرموشن رُک گیا۔ وہ فطرتاً خدا ترس آدمی تھا۔ حاجت مندوں کے لئے اس کے پاس ایک رجسٹر تھا۔ مہینے کی ہر پہلی تاریخ کو وہ ہر ایک کے نام منی آرڈر روانہ کر دیتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ توہم پرست بھی تھا۔ ہمیشہ سونے سے قبل بنگلے کی ایک کوٹھری میں جاکر خود اپنے ہاتھ سے شمع روشن کرتا اور لوبان سلگاتا، اس کا خیال تھا کہ اس تنگ و تاریک کوٹھری میں کسی شہید مرد کا گزر ہے، بڑی عجیب سی بات تھی جس نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے کڑیل نوجوانوں کو تہ تیغ کیا تھا خود ایک مردے سے ڈرتا تھا۔

بوڑھے کرنل کے یہاں فرقان کی آمد و رفت کو کئی ہفتے ہوگئے تھے۔ کرنل کی بیوی ابھی تک سینی ٹوریم میں تھی، سیما کبھی کبھار رات کو وہاں جاکر ٹھہر جاتی تھی، وہ خود بھی ہر دوسرے، تیسرے دن بیوی سے

ملنے جاتا تھا۔ فرقان نے کئی بار سینی ٹوریم جانے کا ارادہ کیا مگر کبھی وہاں جا نہ سکا۔

مارچ کی ایک ویران رات کا ذکر ہے، ہر طرف اجلی چاندنی پھیلی ہوئی تھی ہَوا بہت تیز تھی۔ پت جھڑ کے مارے ہوئے درختوں کے نیچے خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ فرقان، بوڑھے کرنل سے ملنے گیا۔ اتفاق سے وہ موجود نہ تھا۔ حسب معمول وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ خاصی رات ہوگئی وہ اکتا کر باہر آگیا۔

رات اب نکھر گئی تھی۔ اچانک اس کی نظر اس طرف چلی گئی، جہاں ایک مختصر سی چٹان پر کوئی سفید لباس میں بیٹھا تھا۔ یہ سیما تھی، روپہلی چاندنی میں اس کا لباس اور بھی اجلا لگ رہا تھا۔ وہ بے اختیار اس طرف چلدیا —— خشک پتوں پر اس کے قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ ابھرتی رہی مگر سیما نے مڑ کر دیکھا تک بھی نہیں، یہاں تک کہ وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ ایک بارگی اس نے چونک کر فرقان کی جانب دیکھا۔ لمحہ بھر کے لئے دونوں نے ایک دوسرے کو گہری نظروں سے دیکھا اور اس ایک لمحہ میں سیما اس کو غضب کی حسین معلوم ہوئی۔

سنکی ہوئی ہَوا چلتی رہی، خشک پتے سرگوشیاں کرتے رہے اور چاندنی کا عکس جگمگ جگمگ کرتا رہا۔ سیما نے ایک لفظ کہے بغیر ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا اور اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بنگلے کے اندر چلی گئی اور جب اس کے قدموں کی آہٹ مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی تو اس نے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگائی اور کئی لمبے لمبے کش لگا کر احمقوں کی طرح خواہ مخواہ مسکرانے لگا۔ استاد یہ تو چوٹ ہوگئی، تم سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ چودھویں کے اس چاند کے متعلق تھوڑی سی الٹی سیدھی شاعری کر ڈالتے، کچھ صاحبزادی کی شان میں قصیدہ خوانی کردیتے۔ معلوم ہوتا ہے رُعب کھا گئے۔ مگر ایک بات ماننا پڑے گی، لونڈیا ہے۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ فرقان نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اچھا بھئی فی الحال تو اب کھڑے پچھتاتے رہو۔ پھر اس نے سگریٹ پھینک کر جوتے سے مسل ڈالی۔ اچھا شہزادی تمھارے لئے اب کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد کئی روز گزر گئے۔ کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روزانہ رات گئے تک بوڑھے کرنل سے باتیں

ہوتیں۔ راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریاں کریدی جاتیں۔ کرنل کبھی دکھ سے آہ بھرتا کبھی خوشی سے کھلکھلا کر ہنس پڑتا اور فرقان کی نظر ہر آہٹ پر دروازے کی جانب اٹھ جاتی اور ہر بار ناامید ہو کر پلٹتی۔

انہی دنوں ایک دفعہ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ بڈھا کرنل کسی سے ملنے سرِ شام ہی چلا گیا تھا۔ فرقان نے تھوڑی دیر تک اس کا انتظار کیا۔ پھر وہ اٹھ کر سیما کے کمرے کی طرف چلدیا۔ لیکن کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ بڑی کوفت ہوئی۔ دروازے پر دستک دینے کا کوئی تک نہ تھا۔ واپس آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ مگر قرار نہ آیا، اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔

ٹہلتے ٹہلتے اس نے میز پر رکھا ہوا شیشے کا ایش ٹرے اٹھایا اور اس زور سے دیوار پر کھینچ مارا کہ وہ چکنا چور ہو گیا۔ سناٹے میں شیشوں کی جھنکار بڑے خوفناک انداز میں ابھری۔ فرقان دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد قدموں کی چاپ سُنائی دی، اس کا دل دھڑکنے لگا مگر یہ کرنل کا ملازم تھا۔ اس نے صرف کھانے کے متعلق دریافت کیا، اور اس کے انکار پر چپ چاپ واپس چلا گیا۔

وار صاف خالی گیا تھا۔ فرقان کو سخت تاؤ آیا اس نے ٹوٹے ہوئے ایش ٹرے کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور کلائی پر رکھکر کھال کو چیر ڈالا۔ جیتا جاگتا خون گوشت کے اندر سے ابل پڑا، اس کی کلائی خون سے لہولہان ہو گئی، وہ اسی عالم میں سیما کے کمرے پر پہنچا۔ دروازہ ہنوز بند تھا۔ اس نے دروازہ پر دستک دی۔ تھوڑی دیر دروازہ کھل گیا۔ فرقان نے فوراً کہا۔

"آپ کے پاس آیوڈین تو نہیں ہوگا، ہاتھ میں ذرا خراش آگئی ہے۔"

وہ بڑی بے نیازی سے بولی۔ "دیکھئے تلاش کرتی ہوں کہیں رکھا تو ہے۔" اور وہ کمرے کے اندر جاکر الماری میں رکھا ہوا سامان اِدھر اُدھر الٹنے پلٹنے لگی۔ فرقان دہلیز پر کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ سے خون ٹپک ٹپک کر فرش پر گرتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ واپس لوٹی۔ فرقان کہنے لگا۔

"میں نے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کر دیا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے قریب آگئی۔ فرش پر گرے ہوئے جیتے جیتے خون کو دیکھکر وہ ایک بارگی خوف زدہ ہو گئی۔ پریشان ہو کر بولی۔

"ارے یہ تو بہت سا خون نکل گیا۔ آپنے تو کہا تھا کہ ذرا سی خراش لگ گئی ہے۔ یہ اتنا گہرا زخم کیسے لگ گیا۔"

فرقان خاموش کھڑا رہا، اس نے قرون وسطیٰ کے کسی سرفروش کی طرح بے باکی سے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا وہ تقریباً چیخ پڑی۔ "ہائے اللہ! آپ کا ہاتھ تو خون میں تربتر ہو رہا ہے۔"

وہ بڑی بدحواس نظر آ رہی تھی۔ گاڑھا گاڑھا سرخ خون دیکھ کر وہ کانپ اٹھی۔ جلدی جلدی کہنے لگی۔ "تو آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں اندر آ جائیے!"

وہ بڑی سعادت مندی کے ساتھ چپ چاپ کمرے کے اندر چلا گیا۔

سیما گھبرائی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی دودھ کی طرح شفاف ساڑی کا پلو اٹھا کر جلدی سے اس کو پھاڑ کر کپڑے کا ایک ٹکڑا نکالا اور کلائی پر سے خون صاف کرنے لگی۔ آخر کلائی کا زخم دکھائی دینے لگا۔ جس کے اندر سے گوشت کا کٹا ہوا لوتھڑا نظر آ رہا تھا۔ جب اس پر آیوڈین لگایا گیا تو تکلیف سے جان پر بن گئی۔ مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ وہ بڑے نڈرپن کے ساتھ ہاتھ تانے کھڑا رہا۔ اس نے کلائی پر پٹی باندھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"آخر یہ چوٹ آئی کیسے بڑا گہرا زخم ہے۔"

فرقان نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا، بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ "زخم لگا نہیں میں نے خود لگایا ہے۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "کیوں؟"

وہ کھلنڈرے پن پر اتر آیا۔ "اب یہ بھی بتاؤں!"

سیما خاموش کھڑی رہی۔

فرقان نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "یہ زخم نہ لگتا تو آپ پٹی کیوں باندھتیں؟"

"ارے!" وہ اور حیرت زدہ ہو گئی۔

وہ اور رومینٹک ہو گیا۔ "میں نے سوچا آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ملنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالنی چاہیئے۔"

اس صاف گوئی پر وہ ششدر رہ گئی۔

فرقان کہنے لگا۔ "اگر یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوتا تو میں نے سوچا تھا کہ اپنے کپڑوں میں آگ لگا

لوں گا۔ بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھ کر تو آپ کو ترس آ ہی جاتا۔"

وہ مسکرا دی۔ "آپ تو بڑے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔"

سیما جھکی ہوئی اس کی کلائی پر پٹی باندھنے میں مشغول تھی۔ اس کی گردن خم کھا کر فرقان کے سینے کے بہت قریب آگئی تھی۔ اُجلی اُجلی جلد پر نیلی نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ فرقان نے بلا جھجک اس کی گردن چوم لی اور اس کے نرم و نازک رخساروں کو اپنے بڑے بڑے بھدے ہاتھوں میں لیکر بڑے بے ڈھنگے پن سے کہنے لگا۔

"سیما تم سے تو کچھ محبت ہو گئی ہے۔

سیما کا سارا جسم لرز اٹھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پل بھر کے لیے اس نے فرقان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور گردن کو پیچھے کی جانب ہٹا لیا اور چپ چاپ اس کے پاس سے چلی گئی۔ پھر اس نے تولیہ اٹھایا اور فرش پر پھیلے ہوئے خون کو صاف کرنے لگی۔

فرقان خاموش کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ اس نے سگریٹ نکال کر سلگائی اور سوچنے لگا۔ مسٹر! یہ تو بڑا مجرب نسخہ رہا۔ سارے مراحل بڑی آسانی سے طے ہو گئے۔ نہ آہیں بھرنے کی نوبت آئی۔۔۔ نہ تارے گن گن کر راتیں کاٹنا پڑیں۔ یار لوگوں نے محبت کو خواہ مخواہ اتنا پیچیدہ بنا دیا ہے۔ در اصل بات یہ ہے کہ عشق کی روایات کو اب بدلنے کا زمانہ آگیا ہے۔ پرانی ٹکنیک کچھ کام نہیں بنتا۔ پھر اس میں تو بڑا نقصان صرف ہوتا ہے۔ بعض تو سنا ہے کہ ایسے مستقل مزاج عاشق گزرے ہیں کہ تمام زندگی روتے دھوتے گزار دی مگر اظہار عشق کی نوبت نہ آئی سخت مسخرے لوگ تھے۔

اب وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ کمرے سے باہر جانے سے قبل اس نے سیما کے شانے کو بڑے پیار سے تھپتھپایا اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ "اچھا! شہزادی خدا حافظ۔"

سیما نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ سدھے ہوئے پالتو جانور کی طرح خاموش کھڑی رہی۔ فرقان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بنگلے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ہوٹل سے فون کیا۔ دوسری طرف سے سیما کی آواز ابھری

فرقان نے پوچھا۔ "کرنل صاحب آگئے!"

وہ اس کی بات پوری طرح سمجھ نہ سکی۔ "آپ کس کو پوچھ رہے ہیں؟"

وہ اس وقت موڈ میں تھا کہنے لگا۔ "آپ کے والد ماجد کرنل صاحب، میرے یعنی فرقان احمد خان یوسف زئی کے والد بزرگوار کے اکلوتے دوست۔"

"جی وہ تو ابھی واپس نہیں لوٹے۔"

"آپ ابھی تک سوئی نہیں؟"

"بس سونے ہی جا رہی تھی۔"

فرقان اترانے لگا۔ "لیکن مجھ کو تو نیند نہیں آ رہی ہے۔"

سیما نے جواب دیا۔ "تو کیا لوری سناؤں؟"

اس شوخی پر وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تیر پہلے فریق ثانی کے لگا۔ اس بات سے تو کم از کم یہی اندازہ ہوتا ہے۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ سیما سے کہنے لگا۔ "آپ نے تو آج اکٹھا مہربان ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔ کل کہیں ستاروں کے نظام میں ابتری تو پیدا نہیں ہو جائے گی؟"

وہ کہنے لگی۔ "فی الحال آپ جا کر آرام کیجیے۔ ورنہ ہاتھ کی تکلیف بڑھ جائے گی۔"

وہ بچوں کی طرح مچلنے لگا۔ "مگر نیند ہی نہیں آتی۔"

اس دفعہ سیما نے بڑے پیار سے ڈانٹ دیا۔ "نہیں! نیند آ جائے گی۔"

اور اس نے ریسیور اٹھا کر رکھ دیا۔ فرقان اپنے کمرے میں آ کر بڑی بھونڈی آواز میں کوئی گھٹیا سا فلمی گیت گانے لگا۔

پہلے وہ کرنل کے پاس صرف رات کو جایا کرتا۔ اب دن میں بھی وہ وقت نکال کر پہنچ جاتا۔ وہاں وہ کرنل سے باتیں کرتا اور ایک آدھ بار سیما سے بھی ضرور مل لیتا۔ کرنل یوں تو خاصا آزاد خیال آدمی تھا لیکن سیما سے میل جول قطعی پسند نہ کرتا تھا۔ کبھی کبھار اس نے دوران گفتگو میں سیما کے بارے میں کچھ پوچھا تو وہ بڑی بے رخی سے اس کی بات نظر انداز کر گیا۔ اس نے کبھی اس معاملہ میں فرقان کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ ایک بار جب اس نے کرنل کے روبرو سیما سے اس کی ماں کی علالت کی بابت دریافت کیا تو کرنل نے ناگوار ہونے کے انداز میں ناک بھوں

چڑھا کو کہا تھا۔" ان کی طبیعت ٹھیک ہی ہوگی"۔ پھر اس نے گھور کر بیٹی کی جانب دیکھا اور اس سے کہنے لگا۔ "جاؤ اپنے کمرے میں جاکر بیٹھو ضرورت ہوگی تو خود تم کو بلا لوں گا"۔ اس واقعہ کے بعد فرقان نے اس کے سامنے کبھی سیما سے بات کرنا تو ایک طرف نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں۔

لیکن اس پابندی کے باوجود وہ چوری چھپے ایک کھلنڈرے نوجوان کی طرح سیما کو برابر چھیڑتا رہا۔ یہ بڑی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں۔ کبھی وہ اس کے بال الجھا کر رکھ دیتا۔ کبھی رخسار پر چپت لگادی، کبھی بازو پر چٹکی بھرلی اور یہ ساری حرکتیں اس وقت ہوتی تھیں جب کرنل گھر سے اندر موجود ہوتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کا رویہ قطعی نارمل ہوتا۔

ایک روز کرنل سینٹی ٹوریم گیا ہوا تھا۔ اس اثنا میں فرقان آ گیا۔ سیدھا سیما کے کمرے میں پہنچا ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے ایک دم بول اٹھا۔

"تعلیم کو تو تم نے خیرباد کہہ ہی دیا، کوئی اور پروگرام نہ ہو تو فی الحال شادی ہی کر ڈالو"۔

وہ بھی اسی طرح غیر سنجیدہ ہو کر بولی۔ "کبھی اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا"۔

وہ ہنس کر بولا۔ "تم کو اس کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں قسم کا ایک عدد اشتہار دے ڈالو"۔

وہ نہ جانے کیوں برا مان گئی۔ "جی نہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی"۔

"اس طرح خالی آسامی کے لئے میں بھی امیدوار بن سکوں گا"۔

سیما کے چہرہ پر شگفتگی آ گئی۔ "آپ درخواست بھیجئے اس پر بھی غور کیا جائے گا"۔

اس کو مسرور دیکھ کر فرقان اترانے لگا۔ "پھر بے چارے ریاض کا کیا ہوگا"؟

وہ صاف مکر گئی، پوچھنے لگی۔ "کون ریاض؟"

"وہی ریاض، جن کو تمہاری بادہ فروش آنکھوں میں محبت کی جھلک نظر آتی ہے، جو راتوں کو اختر شماری کرتے ہیں اور دن کو کسی ایسے ویرانے میں جانا چاہتے ہیں، جہاں جانے کی ہر عاشق نامراد دھمکی دیتا ہے"۔

وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ میں کسی ریاض دیاض کو نہیں جانتی"۔

فرقان اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس نے ریاض کے خطوط کے اور نہ جانے کتنے جملے سنا ڈالے۔

سیما برابر اپنی لاعلمی کا اظہار کرتی رہی۔ لیکن وہ بھی بضد رہا۔ بات جو غیر سنجیدگی سے شروع ہوئی تھی بڑھ کر اچانک سنجیدہ صورت اختیار کر گئی، فرقان کو اس کا احساس اس وقت ہوا۔ جب سیما نے چیخ کر کہا۔

"آپ کی بات دوسری ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں کوئی ہرجائی ہوں کہ ساری دنیا سے فلرٹ کرتی پھرتی ہوں"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے اٹھی اور برابر والے کمرے میں جا کر اندر سے بولٹ چڑھا دیا۔

فرقان اس کے اس طرح چلے جانے پر گھبرا گیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر برابر والے کمرے پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا اور اندر سے سیما کی سسکیوں کی آواز سنائی پڑ رہی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ سسکیوں کی آواز بند ہو گئی مگر دروازہ نہ کھلا۔ کئی بار دستک دی کوئی جواب نہ ملا۔ آخر ناامید ہو کر ہوٹل چلا آیا۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد اس نے ٹیلیفون کیا۔ رسیور سیما ہی اٹھایا تھا۔ اسی کی آواز آئی تھی۔

اس نے پوچھا۔

"طبیعت کیسی ہے؟"

اُس نے بے رخی سے جواب دیا۔ "اچھی ہے" اور فوراً ہی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ یہ بات اس کو بڑی بُری معلوم ہوئی۔ جھنجھلا کر اس نے پھر فون کیا۔ دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ آخر کسی نے رسیور اٹھایا۔ مگر یہ سیما نہیں تھی۔ ملازم بول رہا تھا۔

اس روز وہ مسلسل فون کرتا رہا مگر کسی دفعہ بھی سیما کی آواز نہ آئی۔ شام تک فرقان خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہو گیا ہے۔ اتنی سی بات کا اس نے بتنگڑ بنا کر رکھ دیا۔ اس قدر ناراض ہونے کی کیا بات تھی۔

شام کو وہ بوڑھے کرنل کے پاس معمول سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا۔ بارہ بجے رات تک وہاں بیٹھا کرنل سے باتیں کرتا رہا۔ اس عرصہ میں صرف ایک بار سیما وہاں آئی وہ بھی کرنل کے بلانے پر مگر اس نے فرقان کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ کئی بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اس کے کمرے کی طرف گیا مگر دروازہ اندر سے برابر بند رہا۔ اس رات جب وہ واپس گیا تو بہت جھنجھلایا ہوا تھا۔ اُس نے

بے تحاشا سگریٹ نوشی کی اور صبح تک بستر پر پڑا رہا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

دوسرے روز وہ دن چڑھے سو کر اٹھا۔ شب بیداری کے باعث بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے آئینہ کے سامنے اپنی سوجی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں کو دیکھ کر سوچا۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو واقعی از قسم عشق وغیرہ ہو گیا ہے، تمہاری زیادہ ناز برداری نے اس لڑکی کا دماغ خراب کر دیا ہے، سالی اترانے لگی ہے۔ اب اس کا ایک ہی علاج ہے، نو لفٹ، خود بخود راہ راست پر آجائے گی۔ ورنہ تم گئے ہاتھ سے۔ بس اسی میں خیریت ہے کہ آج سے آنا جانا بند۔

اتوار کا دن تھا، فرقان سویرے ہی سویرے نہا دھو کر تیار ہو گیا تھا۔ اتوار کا تمام دن وہ کرنل کے بنگلے پر گزارتا تھا۔ کئی روز بعد پھر اس کو دورہ پڑا۔ باہر نکلا۔ پڑوس کے کمرے میں برج ہو رہا تھا کچھ دیر بیٹھا وہاں برج کھیلتا رہا، آخر پانچ روپے تیرہ آنے ہار کر وہاں سے بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرہ میں آکر خط لکھنے بیٹھا مگر خط نہ لکھا گیا۔ بھوت اسی طرح سر پر سوار تھا۔ آخر اس نے ٹیلیفون کیا۔ خلاف توقع سیما کی آواز سنائی دی۔ فرقان نے جلدی سے کہا۔

"سیما! میں فرقان بول رہا ہوں"

دوسری طرف رسیور زور سے رکھنے کی آواز ابھری سلسلہ منقطع ہو گیا۔

سخت کوفت ہوئی۔ جھنجھلاہٹ کے عالم میں اس نے اپنی انگلی چبا ڈالی اور اس حالت میں دندناتا ہوا کرنل کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس وقت موجود تھا۔ کئی روز غیر حاضر رہنے پر اس نے سخت شکوہ کیا۔ اس کو وہاں پر بیٹھے ہوئے ذرا ہی دیر گزری تھی کہ سیما آگئی۔ اس کو دیکھتے ہی دروازے پر ٹھٹک کر رک گئی اور الٹے قدموں واپس چلی گئی۔

وہ سہ پہر تک وہاں بیٹھا رہا لیکن وہ پھر نظر نہ آئی۔ کرنل نے ایک بار کسی کام سے اس کو بلایا بھی مگر اس نے سر میں درد ہونے کا بہانہ کر دیا۔ خود نہ آئی۔ فرقان چرکے پر چرکے کھاتا چلا گیا۔ کتنا بڑا فرق تھا۔ کہاں تو اس کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ موجود ہوتا تو وہ کسی نہ کسی بہانہ سے کئی کئی بار وہاں آتی اور ہر بار اس کو مسکرا کر دیکھتی، اخبار پڑھتی ہوتی تو معمولی معمولی خبروں کو خواہ مخواہ اہم بنا کر گھنٹوں وہاں

بیٹھتی، اخبار سُناتی رہتی۔

واپس لوٹتے ہوئے اس نے سوچا کہ اب وہ اس بنگلہ پر کبھی نہیں آئے گا۔ یہ رات بڑے ذہنی کرب کے عالم میں کٹی۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ وہ صبح ڈیوٹی پر بھی نہ جا سکا۔ تمام دن پاگل کتے کی طرح سڑکوں کی خاک چھانتا رہا۔ دوپہر کا کھانا اس نے ایک گھٹیا سے ریسٹوراں میں کھایا۔ جہاں مکھیاں بہت تھیں اور المونیم کے برتنوں میں کھانا دیا جاتا تھا۔ اس ریسٹوراں قسم کے بھٹیار خانہ سے نکل کر وہ ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا کہ اس کو کونے میں دیوار کے ساتھ پڑا ہوا چمڑہ کا ایک بوسیدہ سا پرس نظر آیا۔ اس کو اٹھا کر دیکھا تو دس دس کے دو کرارے نوٹوں کے ساتھ وہ تین روپے کی ریزگاری بھی اس میں تھی۔ فرقان نے پرس جھٹ سے پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ اب اس کو جیب میں پڑے ہوئے بوسیدہ پرس کا زیادہ احساس تھا اور سیما کی یاد کم ہو گئی تھی۔ جیسے اس کو کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا سگریٹ کے دو تین لمبے کش لگا کر اس نے سوچا یہ نسخہ تو اچھا رہا۔ بائیس تیئس روپے سے خاصا افاقہ ہو گیا تھا۔ اب تو کوئی ایسا علاج کیا جائے کہ یہ بیماری جڑ سے جاتی رہے۔ ذرا دیر وہ غور کرتا رہا پھر اس نے زور سے چٹکی بجائی۔ اُستاد یہ ہوئی سولہ آنے پکی بات۔ گورِ غریباں چلو۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ سامنے آجائے گا۔ پھر تو کہاں کی سیما اور کہاں کا عشق، دونوں کی ایسی تیسی!

آبادی سے کچھ دور نکل کر عیسائیوں کا ایک قبرستان تھا۔ فرقان اسی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ قبرستان کا پھاٹک کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ سہ پہر ہو چکی تھی اور درختوں کے سائے قبروں پر بکھرے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ پھولوں کے تختے تھے۔ بعض قبروں پر بیلیں چڑھی تھیں، جو ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہی تھیں۔ سنگ مرمر کے اونچے اونچے کتبوں پر مختلف عبارتیں کندہ تھیں۔ پھاٹک کے قریب ہی داہنے ہاتھ کو ایک قبر تھی۔ اس پر بڑا اونچا سا کتبہ نصب تھا۔ عبارت بڑی دلچسپ تھی۔ لکھا تھا۔

یہاں ہنری ولیم دفن ہے جو ۲۲ رمئی ۱۸۹۲ء کو بمقام یارک شائر پیدا ہوا اور ۶ ردسمبر ۱۹۴۲ء کو انتقال ہوا۔ مرحوم کو سانپ پالنے کا شوق تھا۔ ان کی موت کتے کے کاٹنے سے واقع ہوئی۔ جنازے میں وہ کتا بھی

شامل تھا، جس کو بعد میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

فرقان نے کئی بار کتبہ کو پڑھا اور ہر بار اس کو پڑھ کر متاثر ہوا۔ اس نے سوچا۔ یہ سالے انگریز زندہ رہنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ مر کر بھی زندہ رہنے کی ہوس نہ گئی۔ جب تک یہ کتبہ یہاں لگا ہے ــــ یارک شائر میں پیدا ہونے والا ہنری ولیم ضرور زندہ رہے گا۔ آگے بڑھا تو اور بھی کتبے تھے۔ کسی پر بائبل کے اقتباسات تھے کسی پر انگریز شعرا کی نظموں کے حصے تھے۔ بعض پر حساب کے سوالوں کی طرح صرف اعداد و شمار قسم کی عبارتیں کندہ تھیں۔ وہ ایک ایک کتبہ کو پڑھتا ہوا قبرستان کے ایک سرے سے دوسرے تک چلا گیا۔ واپسی پر ایک گھنے درخت کے نیچے ایک قبر تھی جس پر ایک دھندلا سا کتبہ تھا اس پر نظر پڑی تو وہیں ٹھہر گیا، کچھ اس قسم کی عبارت تھی :

> یہ میری تیسری موت ہے پہلی موت اس وقت واقع ہوئی جب میں نے شادی کی تھی، دوسری اس روز جب عدالت نے طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے بچو کبھی رنگین شیشوں والا چشمہ نہ لگانا کہ یہ تمام مصیبتوں کی جڑ ہوتا ہے۔

نیچے لکھا تھا کہ یہ عبارت متوفی کی وصیت کے مطابق لکھوائی گئی۔ فرقان نے اس عبارت کو پڑھا تو مسکرا دیا۔ بیچارہ بڑا مظلوم تھا۔ اچانک اس کو خیال آیا کہ وہ گاگلز لگائے ہوئے تھے۔ اس نے جھٹ سے ان کو آنکھوں پر سے اتار لیا۔ اس وقت اس کا منہ مغرب کی طرف تھا۔ جہاں اپریل کا دہکتا ہوا سورج جھک رہا تھا۔ ایک دم سے دھوپ کی تیز کرنیں آنکھوں پر پڑیں تو وہ چندھیا کر رہ گیا۔ پھر اس کو خود ہی اپنی حماقت کا احساس ہوا اور اس نے جھٹ سے گاگلز آنکھوں پر لگا لیے۔

جب وہ واپس لوٹا تو شام ہو چکی تھی۔ ابھی تک اس کی آنکھوں میں قبرستان کے کتبے گردش کر رہے تھے اور آخری کتبہ اس کو بار بار یاد آ رہا تھا۔ رات کو سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو اس کا احساس اور بھی شدید تھا۔ پھر اس نے سوچا "یار مرحوم نے تو بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ زندگی کو رنگین چشموں کے بجائے برہنہ آنکھوں سے دیکھو تو اور ہی بات نکلتی ہے۔ یہ لڑکی جو سیما ہے جس کے لئے تم دیوانے ہو رہے ہو۔ مان لو وہ من گئی پھر وہی چوری چھپے کی ملاقاتیں، وہی ناز و نیاز اور پھر

ایک دن وہی ہوگا جو عام طور پر ہوتا ہے۔ یعنی بیاہ، وہ گیا کہتی ہیں اس موقع پر بڑی بڑی بوڑھیاں گاجر کی پینڈی گل خیرو کے پھول، کہو میاں گڈے، گڑیا قبول۔ تو فرقان احمد خاں سلمہ زائد سے زائد یہی ہوگا۔ اور ایمان داری سے تو تم چاہتے بھی یہی ہو۔ مگر مولانا خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس نیکبخت کے ڈیڑھ درجن سے تو کیا کم عاشق ہوں گے۔ مطلب اس کا یہ ہوا کہ ڈیڑھ درجن سے زیادہ مرتبہ تمہاری موت واقع ہوگی۔ لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ آج اور اسی وقت توبہ کرلو۔ فرقان نے اُسی وقت توبہ کرلی اور رات بھر خوب خرّاٹے بھر بھر کر سوتا رہا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ رات کی نیت حرام۔ وہی فرقان کے ساتھ ہوا۔ دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ گیا۔ شام ہوئی تو ایمان خطرے میں تھا۔ وہی جنون، وہی شوریدہ سری۔ مگر وہ کرنل کے بنگلہ پر نہیں گیا بلکہ سیوائے بار میں گھس گیا۔ کوئی ۱۱ بجے کے قریب وہ بار سے نکلا تو نشہ میں دھت تھا اس وقت اتنا احساس ضرور تھا کہ وہ اس سڑک سے ہوکر ہوٹل نہیں گیا۔ جس پر کرنل کے بنگلہ کی جانب راستہ جاتا تھا بلکہ بڑا لمبا راستہ کاٹ کر ہوٹل کو پہنچا۔

لیکن جس بات کو بھول جانے کے لئے اس نے یہ حماقت کی تھی، وہ خیال ذہن سے نہ نکلا نشہ جس قدر کم ہوتا گیا، سیما کی یاد اسی قدر شدید تر ہوتی گئی۔ بار بار وہ جھنجھلا کر اٹھتا کہ ابھی جاکر ٹیلیفون پر سیما کو خوب گالیاں دے۔ سالی نے اچھا خاصا اُلّو کا پٹھا بنا کر رکھدیا ہے۔

رات اور سنسان ہوگئی۔ نیند کا کہیں کوسوں پتہ نہ تھا۔ آخر وہ اٹھ بیٹھا اور چوٹ کھائی ہوئی شہد کی مکھی کی طرح، کمرے کے اندر بولایا ہوا سا چکر کاٹنے لگا۔ پھر اس نے کپڑے تبدیل کئے اور سڑکوں کی آوارہ گردی کے خیال سے باہر چلا گیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ دور تک درختوں کے گہرے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں چلتا ہوا وہ دُور تک چلا گیا۔ ایکا ایکی اُس نے سوچا کہ میں اس وقت بوڑھے کرنل کے پاس پہنچ جاؤں تو کیسی رہے، اس خیال کے ساتھ ہی وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ تذبذب۔ جھنجھلاہٹ۔ ہزیمت۔ ایک کے بعد دوسرا احساس آخری فیصلہ جس بات پر ہوا وہ یہی تھی کہ آدھ گھنٹے بعد وہ کرنل کے بنگلے کے سامنے کھڑا تھا۔

دیر تک وہ خوابناک نظروں سے بنگلے کو گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ سارے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ اس نے مشتبہ طور پر بنگلے کا ایک چکر لگایا اور اس مقام پر پہنچ گیا، جہاں ملازموں کے کوارٹر تھے۔ یہ بنگلے کا پچھلا حصہ تھا۔ ہر طرف سکوت ہی سکوت تھا۔ سب گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا بنگلے کے پچھلے دروازے پر گیا۔ اُس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر اس کو آہستہ سے ہلایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ پھر اس نے دیوار کو دیکھا۔ دیوار زیادہ بلند نہ تھی۔ ایک بار اس نے بلی کی طرح اچک کر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی تو پھر پھسل گیا اور وہ نیچے آ رہا۔ وہاں ٹین کا ایک ڈبہ پڑا تھا، جو اس کے پیروں کے نیچے آ کر زور سے بج اٹھا۔ وہ وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ دیر تک جب کوئی آہٹ نہ ابھری تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی اور اس دفعہ وہ دیوار پر پہنچ گیا لیکن اس کی پتلون گھٹنے پر سے پھٹ گئی اور جلد پر بھی گہری خراش آ گئی۔ کچھ سوچنے کا موقع نہ تھا، وہ آہستہ سے کود کر صحن میں پہنچ گیا۔

چوروں کی طرح پنجوں کے بل چلتا ہوا پہلے وہ بوڑھے کرنل کے کمرے کے پاس پہنچا۔ کان لگا کر سنا اندر سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ کرنل گہری نیند سو رہا تھا۔ وہاں سے اطمینان کر کے وہ اسی طرح سنبھل سنبھل کر ایک ایک قدم تول کر رکھتا ہوا سیما کے کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ کمرے کے اندر ہلکی ہلکی روشنی پھیلی تھی۔ اس نے دروازہ پر ہاتھ رکھا۔ خلاف توقع دروازہ کھل گیا۔ جھری سے اس نے جھانک کر دیکھا۔ سامنے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں سیما جھکی ہوئی لکھنے میں مصروف تھی۔ اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور کمرے کے اندر پہنچ گیا۔

ذرا دیر وہ سانس روکے ہوئے اس کو دیکھتا۔ پھر دبے قدموں چلتا ہوا اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لکھنے میں اس قدر مشغول تھی کہ اس کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ فرقان نے آہستہ سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ خوف کے مارے سیما کی گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔

اُس نے پلٹ کر دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"ارے آپ؟"

"بڑا تعجب ہوا تم کو!"

سیما نے گردن ہلا دی۔ "تعجب کی بات ہی ہے!"

وہ اب تک خوف سے کانپ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک دونوں بالکل خاموش رہے۔

فرقان نے اُس کو نظر بھر کر دیکھا وہی نرگس کے تازہ پھولوں کی سی شفاف آنکھیں، وہی دہکتے ہوئے عارض، وہی پھڑکتے ہوئے شبنمی ہونٹ۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس بھری۔ واقعی یہ لڑکی غضب کی خوبصورت ہے۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا۔

"سیما!"

اُس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "جی!"

فرقان سے بولا نہ گیا لحظہ بھر توقف کر کے وہ خود ہی بولی۔ "اتنی رات گئے چوروں کی طرح یہاں آتے آپ کو ڈر نہیں معلوم ہوا؟"

وہ کہنے لگا۔ "میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ دماغ خراب نہ ہوتا تو اس طرح تمھارے پاس کیوں آتا؟"

وہ بڑے تیکھے لہجہ میں بولی۔ "لیکن آپ جس لڑکی کو ایک بار بدچلن سمجھ چکے ہیں۔ اب اس کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

فرقان نے اس کو فوراً ڈانٹ دیا "سستے ناول پڑھ پڑھ کر تم گھٹیا پن سے سوچنے لگی ہو۔"

پھر اُس نے صفائی پیش کی۔ "نہ میری بات کا یہ مقصد تھا جو تم سمجھ رہی ہو اور نہ میں نے کبھی تمھارے کردار کے متعلق ایسی بیہودہ بات سوچی۔"

وہ اپنی ضد پر اس طرح اڑی رہی۔ "جی نہیں آپ کا بالکل یہی مطلب تھا۔ خواہ مخواہ بات بنانے کی کوشش نہ کیجیے، بہرحال اب جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا۔"

فرقان کو اس کی یہ ہٹ دھرمی سخت ناگوار معلوم ہوئی۔ جل کر بولا۔ "تم بالکل اُلو کی پٹھی ہو۔"

سیما بھونچکا ہو کر رہ گئی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ فرقان نے اس کو گالی تو دے دی

لیکن بعد میں بڑا سٹپٹایا۔ آخر اس کو منانے کی غرض سے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر جذباتی لڑکی ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس طرح ناراض نہیں ہوا کرتے۔" اور پھر وہ بے حد جذباتی ہو گیا۔ اس نے سیما کے رخساروں کو، گردن کو، پیشانی کو، آنکھوں کو بے تحاشا چومنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ ذرا کے ذرا میں صابن کی ٹکیہ کی طرح اس کی گرفت سے نکل کر دور چلی گئی۔ اس کی ضد ابھی تک برقرار تھی۔

"جی نہیں، میرے دل سے یہ پھانس نہیں نکل سکتی۔ خدا کے لئے آپ مجھ سے نفرت کیوں نہیں کرتے۔ اس قدر ذلیل سمجھنے کے بعد بھی آخر آپ کو مجھ سے نفرت کیوں نہیں ہوئی؟"

وہ تیزی سے بولتی چلی گئی، پھر اس کی آواز بھرّا گئی اور دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔

فرقان کو اس حرکت پر سخت تاؤ آیا۔ عجیب نامعقول لڑکی ہے۔ آخر یہ کیا چاہتی ہے۔ ذرا دیر تک وہ تذبذب کے عالم میں گم سم کھڑا رہا۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑا اور مکڑی کی طرح اس کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ وہ مچھلی کی طرح تلملانے لگی۔ فرقان کی دیوانگی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس نے سیما کا لباس تار تار کر ڈالا۔ اس کے بازوؤں کو، رخساروں کو، شانوں کو اپنے تیز دانتوں سے چبا ڈالا۔ سیما درد سے چیخ اٹھی۔ وہ واقعی دیوانہ ہو رہا تھا۔ سیما کی چیخوں کا اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی کرنل کی بھاری بلغمی آواز بھرّائی۔

"سیما یہ اتنی رات کو تم نے کیا شور مچا رکھا ہے۔" فرقان لرز کر رہ گیا۔ اس وقت وہ ٹیبل لیمپ کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے گھبرا کر کرنل کی جانب دیکھا۔ معلوم نہیں کرنل نے اس کو دیکھا کہ نہیں لیکن فرقان ہاتھ بڑھا کر لیمپ بجھا چکا تھا۔ کمرے کے اندر تاریکی پھیل گئی۔ ذرا دیر تک تو فرقان پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتا کہ اب وہ کیا کرے۔ پھر وہ لپک کر کھڑکی کے پاس گیا، اس لئے کہ دروازے پر تو کرنل کھڑا تھا۔

کھڑکی پر چڑھ کر اس نے ایک نظر نیچے ڈالی اور آنکھیں بند کر کے پھاند پڑا۔ بلندی زیادہ

نہ تھی۔ وہ صاف بچ گیا۔ البتہ اس کے ٹخنہ میں کچھ چوٹ آگئی تھی۔ کھڑکی پر چڑھتے ہوئے ایک جوتا بھی پیر سے نکل کر کمرے کے اندر رہ گیا تھا۔ اس نے بات کی مطلق توجہ نہ دی اور لنگڑاتا ہوا تیز تیز قدموں سے چلتا۔ وہاں سے دور نکل گیا۔ خوف اور گھبراہٹ کے مارے اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

ہوٹل پہنچکر وہ دیر تک اپنی حماقت پر پچھتاتا رہا۔

صبح ہوتے ہوتے اس کا ٹخنہ سوج کر فیل پائے کی طرح بن گیا۔ ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا تو معلوم ہوا کہ جوڑ پر سے ہڈی اتر گئی ہے۔ چوٹ خاصی سخت تھی۔ تکلیف سے اس کو بخار بھی ہو گیا تھا۔ ذہنی کرب الگ تھا۔ جب بھی رات کا واقعہ یاد آتا منہ پر ایک تھپڑ سا پڑتا۔ نہ جانے سیما کیا سوچتی ہوگی۔ پتہ نہیں مجھ کو کیا ہو گیا تھا جو اس قدر پاگل پن پر اتر آیا۔ معلوم نہیں اب کیا ہوگا۔ لیکن اور تو کچھ نہیں ہوا صرف اس کو ہسپتال میں داخل کرادیا گیا۔

ہفتہ بھر بعد وہ اسپتال سے نکلا تو بڑا تر و تازہ نظر آرہا تھا۔ اسی روز وہ بوڑھے کرنل کے بنگلہ پر پہنچا لیکن آج وہ بڑی بے رخی سے پیش آیا۔ یہ تک نہ پوچھا کہ اتنے عرصہ تک وہ کہاں رہا۔ زیادہ بات ہی نہ کی۔ تمام وقت ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے بیٹھا باتیں کرتا رہا

دونوں کی گفتگو سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ نو وارد اس کا کوئی قرابت دار تھا اور اسی کی طرح ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ کچھ عرصہ سے کرنل ہی کے بنگلہ میں مقیم تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں ایک چھریرے جسم کا نوجوان بھی آگیا۔ جلد ہی اس کو پتہ چل گیا کہ وہ اس شخص کا لڑکا تھا۔ اور خواہ مخواہ اسمارٹ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اترا اترا کر بڑے چھچھورے پن سے بات کرتا تھا۔ فرقان کو اس سے للٰہی بغض ہو گیا۔ آخر وہ اکتا کر چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ خلاف معمول کرنل نے اس کو روکنے کے لئے ذرا بھی اصرار نہ کیا۔

واپس لوٹتے ہوئے اس نے سوچا کہ آج کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر یہ تو قطعی اندازہ ہو گیا کہ اس روز رات کو کرنل نے اس کو دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی جانب سے خاصا برگشتہ ہے لیکن

یہ سالا اترا اترا کر باتیں کرنے والا مداری کہاں سے آ ٹپکا۔ حالات کہیں خدانخواستہ کوئی خطرناک صورت تو اختیار کرنے والے نہیں ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ چھچھورے قسم کا نوجوان رقیب روسیاہ کے روپ میں بھوت بن کر اس کے سامنے قہقہے لگانے لگا۔ اس پر جنون کا پھر دورہ پڑا۔ دوسرے دن شام کو وہ پھر کرنل کے پاس پہنچا۔ اس کے انداز میں وہی کل کی سی بے نیازی تھی۔ فرقان دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ آج کی باتوں سے اس کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کرنل کا مہمان کسی زمانہ میں پولیس کا کوئی بڑا افسر رہ چکا تھا۔ اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے رشوت وصول کی تھی اور اب بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہا تھا، اس کا لڑکا عنقریب اعلیٰ تعلیم کے لئے کنیڈا جانے والا تھا اور اس وقت سیما کے ساتھ پکچر دیکھنے گیا تھا۔ فرقان کو اس بات کا پتہ چلا تو اور بھی جھنجھلایا۔

کرنل کے بنگلے سے نکل کر وہ ہوٹل جانے کے بجائے تمام سینما گھروں کا چکر کاٹتا رہا مگر وہ دونوں کہیں نظر نہ آئے۔ واپسی پر وہ تھکن سے چور ہو چکا تھا۔ جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ اُس نے آئینہ دیکھا تو مسلسل شب بیداری اور الجھن سے اس کا چہرہ، خود اس کو خوفناک نظر آ رہا تھا۔ اس کو اپنی حالت پر ترس آ گیا۔ جی چاہا کہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ اسی اثنا میں ہوٹل کے منیجر نے اس کو ایک لفافہ بھجوایا۔ فرقان نے اس کو کھول کر دیکھا۔ ہیڈ آفس سے آرڈر آیا تھا۔ کہ وہ اپنا دورہ ختم کر کے فوراً واپس لوٹ آئے۔ فرقان ذرا دیر تک تو اس سرکاری خط کو دیکھتا رہا۔ پھر دیوانوں کی طرح اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جوتے سے مسل ڈالا۔

تمام رات آنکھوں میں کٹی۔ بستر سے اٹھا تو سر بھاری بھاری تھا جسم بری طرح سے ٹوٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دہشت برس رہی تھی۔ اسی عالم میں وہ اٹھ کر کرنل کے بنگلہ پر پہنچ گیا۔ اس وقت پنشن یافتہ پولیس افسر کہیں گیا ہوا تھا۔ اس لئے سوچا کہ ہو سکے تو آج کرنل سے سیما کے متعلق دو دو باتیں ہو جائیں۔ مگر کرنل نے اس بات کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ وہ برابر اس چھچھورے نوجوان کے متعلق باتیں کرتا رہا جس کا نام آصف تھا۔ اس کی تعریف فرقان سے نہ سنی گئی لہٰذا سر میں درد ہونے کا عذر کر کے وہاں سے اُٹھ آیا۔

ہوٹل پہنچکر اس نے فون کیا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ وقت کرنل کے سونے کا ہے۔ دوپہر کا کھانا کھاکر وہ گھنٹہ دو گھنٹہ بلاناغہ سویا کرتا تھا۔ اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ ملازم نے بتایا کہ کرنل صاحب سو رہے ہیں۔ تین بجے سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے سیما کے متعلق پوچھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اس نے جرأت سے کام لے کر ملازم سے کہا کہ ذرا سیما کو ٹیلیفون پر بلا دو۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس نے سیما کو اس طرح بلوایا تھا۔ عام طور پر وہ بڑی احتیاط سے کام لیتا تھا۔

ملازم نے ذرا دیر بعد آکر جواب دیا کہ وہ کہہ رہی ہیں کہ میری طبیعت خراب ہے۔ میں نہیں آسکتی۔ فرقان کے آگ ہی تو لگ گئی۔ بڑے تیکھے لہجہ میں بولا۔

"ان سے کہدو کہ آج رات میں کسی وقت اُن سے ملنے ضرور آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔ دیکھو بھولنا مت، کہہ ضرور دینا۔"

کہنے کو تو اس نے یہ بات کہہ دی۔ مگر بعد میں دیر تک پچھتاتا رہا۔ اس نے خود غور کیا۔ پتہ نہیں مجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ حماقت پر حماقت سرزد ہو رہی ہے۔ دماغ ہے کہ سالا ناریل کے گودے کی طرح پلپلا ہو گیا ہے۔ کچھ کام ہی نہیں کرتا۔ وہ خاموش بیٹھا دیر تک ایسی اُوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا۔

اسی اثنا میں اس کا ٹیلیفون آیا۔ اس نے جا کر رسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے سیما بول رہی تھی۔

"واقعی آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ آپ سب کیا کر رہے ہیں؟"

لیکن آج وہ اپنی انا کا ذرا بھی بھرم قائم نہ رکھ سکا۔ بڑی بے چارگی سے بولا۔

"ہاں سیما! مجھ کو خود پتہ نہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میری شہزادی میں واقعی پاگل ہو گیا ہوں۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں تم کو کیسے بتاؤں کہ میں کتنا مجبور ہو گیا ہوں۔ خدا کے لئے اس وقت مجھے نہ ستاؤ۔ مجھ سے ہمدردی کرو کہ اس وقت مجھکو ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اب تو میں ایک زخم بن کر رہ گیا ہوں۔ ٹھیس لگی اور میں بلبلا اٹھا۔ خدایا مجھکو کیا ہو گیا ہے۔"

وہ کہتا ہی چلا گیا۔ اس کو مطلق احساس نہ ہوا کہ وہ اپنی سطح سے کتنا گر چکا ہے۔

سیما اس کو بڑے پیار سے سمجھانے لگی۔ "ارے آپ اس قدر جلد گھبرا گئے۔ ہمت سے کام لیجئے۔

مجھکو تو آپ کی ذہانت پر بڑا ناز تھا۔ عورتوں کی طرح رونے دھونے سے کیسے کام چلے گا۔
اس وقت نہیں، میں پھر کسی وقت آپ سے باتیں کروں گی۔"

اس کے لہجہ میں فتحمندی کا احساس تھا۔

فرقان نے فوراً کہا۔

" تو پھر میں آج رات تمھارے پاس آرہا ہوں۔"

وہ گھبرا کر بولی۔ "نہیں نہیں، خدا کے لئے یہ نہ کیجئے گا۔"

وہ ضد کرنے لگا۔ " نہیں آج تو میں ضرور آؤں گا۔ جب تک تم سے جی کھول کر باتیں نہیں کروں گا۔ مجھ کو چین نہیں آئے گا۔"

وہ ناراضگی سے بولی۔ " پھر آپ کا دماغ خراب ہوا۔ نہیں آپ ہرگز ایسا نہ کیجئے گا۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے رسیور رکھدیا۔ لیکن اس وقت سیما کی حرکت اس کو بری نہ معلوم ہوئی۔

سہ پہر تک وہ بڑا خوش رہا۔ شام کو اس نے بڑے اہتمام سے کپڑے تبدیل کئے اور خوب بن سنور کر ٹہلنے کے لئے باہر چلدیا۔ جب وہ لوٹ رہا تھا تو اچانک بازار کے ایک موڑ پر اُسے آصف نظر آیا۔ اس کے ہمراہ سیما بھی تھی۔ وہ نئی بیاہی ہوئی دلہن کی طرح شرما شرما کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر دونوں کے قریب سے گزرا مگر ان کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ معلوم نہیں سیما نے اس کو دیکھا بھی یا نہیں۔ فرقان کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ وہ بازار کے دوسرے سرے تک گیا۔ پھر واپس لوٹا تو وہ جا چکے تھے۔ اس نے ایک دوکان سے بڑا سا شکاری چاقو خریدا۔ اس کو حفاظت سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور بار میں گھس گیا۔ رات گئے تک وہ بیٹھا شراب پیتا رہا۔ آخر جب بار بند ہونے لگا تو وہ باہر نکلا۔ سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگائے اور وہ لڑھکتا ہوا سڑک پر آگیا۔ کئی منٹ تک وہ فرش پر پڑا تھکے ہوئے خچر کی طرح ہانپتا رہا۔ پھر اُس نے اُٹھ کر اپنے گرد اکٹھا ہونے والے راہ گیروں کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف چلدیا۔

بارہ بج گئے۔ ساڑھے بارہ ایک، پھر ڈیڑھ کا عمل ہوگیا۔ وہ تمام وقت سڑکوں پر آوارہ پھرتا رہا۔ آخر ایک سنسان سی جگہ وہ سستانے کیلئے ٹھہر گیا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا۔ اُس کو کھول کر دیکھا۔ دھار پر انگلی پھیری اور کسی منجھے ہوئے جرائم کی طرح چاقو کو چوم کر جیب کے اندر رکھ لیا اور تیز تیز قدموں سے کرنل کے بنگلہ کی جانب چلدیا۔

اس وقت چاند کو گہن لگ رہا تھا۔ چاندنی پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔ ہوا کی رفتار سست تھی اور درخت گردن اٹھائے ساکت کھڑے تھے۔ بڑی ویران رات تھی۔ راستوں پر جھینگی شور مچاتے ہوئے دوڑ رہے تھے "پُن کرو، پُن کرو" ان کی بے ہنگم آوازیں اُداس رات کی خاموشی میں بڑی ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ فرقان نے کسی طرف توجہ نہ دی۔ وہ ایک ہی دھن ایک ہی لگن کے ساتھ چلتا رہا۔ جھینگیوں کی ملی جلی آوازوں کا شور دُور ہوتا گیا اور وہ آبادی سے نکل کر ویران علاقہ میں آگیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کرنل کے بنگلے کے سامنے تھا۔ چاروں طرف قبرستان کا سا سناٹا تھا وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس جگہ پر پہنچ گیا' جہاں سے سیما کا کمرہ نظر آتا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی کھلی تھی اندر اندھیرا تھا وہ اب سو چکی تھی، وہ ٹکٹکی باندھے کھڑکی کی جانب دیکھتا رہا۔ کھڑکی خاصی بلندی پر تھی۔ وہاں تک پہنچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ذرا دیر تک وہ بھوکے کتے کی طرح اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ اچانک اس کی سمجھ میں ایک بات آگئی۔ دوسرے لمحہ وہ بجلی کے کھمبے پر چڑھ رہا تھا کھمبا کھڑکی سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ آسانی سے کھڑکی کی کارنس پر ایک قدم جمانے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کی چوکھٹ پکڑ لی اور اسی کے سہارے کمرے کے اندر چلا گیا۔

کھڑکی سے پیٹھ ٹکائے وہ اندھیرے میں خاموش کھڑا رہا۔ جب کوئی آہٹ نہ سنائی دی تو وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میز کے قریب گیا اور ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ مگر سیما کا بستر خالی پڑا تھا۔ وہ وہاں نہ تھی۔ غصہ اور ناامیدی کے عالم میں اس نے اپنا ہونٹ چبا ڈالا۔ اسی وقت اس نے اپنی پشت پر آہٹ محسوس کی۔ اس نے چونک کر پلٹنا چاہا تو ایک مضبوط ہاتھ اس کی گردن پر آیا اور زور سے اس کو دبوچ لیا۔ کوئی اس کی پشت پر کھڑا سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ " اگر آواز نکلی تو گلا

گھونٹ دوں گا۔" فرقان نے آواز پہچان لی۔ یہ ادھیڑ عمر کا ریٹائرڈ پولیس افسر تھا وہ سہم کر رہ گیا۔ زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ دوبارہ پھر آواز آئی۔

"چپ چاپ میرے ساتھ چلے چلو۔"

فرقان نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ وہ گردن دبوچے ہوئے اس کو کمرے سے ڈھکیلتا ہوا باہر لے آیا۔ غلام گردش سے گزرتے ہوئے دونوں اس کمرے میں آگئے جہاں روشنی تھی مگر بڑی دھندلی۔ اس کمرے میں پہنچکر اس نے فرقان کی گردن چھوڑ دی۔ دروازے کا بولٹ چڑھایا اور صوفہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ لمحہ بھر تک اس کو گھور کر دیکھتا رہا۔ فرقان نے نظریں جھکالیں مگر جب اس نے خالص پولیس والوں کے سے انداز میں پوچھا۔ "کیوں بے چوری کرنے گھسا تھا؟" تو وہ ششدر رہ گیا۔ اس لئے کہ وہ کرنل کے پاس اس کو ایک بار دیکھ چکا تھا، مگر یا تو اس نے فرقان کو پہچانا نہیں یا پھر پہچاننے کی کوشش نہیں کی۔ ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر اس نے ڈانٹ کر کہا۔

"ابے بولتا کیوں نہیں؟"

فرقان کپکپا بھی گیا۔ گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ وہ شخص اُٹھ کر فرقان کے قریب آیا اور مُنہ پر ایک زنائے کا ہاتھ دیا۔ فرقان لڑکھڑا کر رہ گیا۔ بدحواس ہو کر کہنے لگا۔

"جی نہیں میں تو ——— !"

فرقان آگے اور کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ شخص بگڑ کر بولا۔ "جی، میں تو ذرا ٹہلتا ہوا اِدھر آ گیا تھا۔"

اس نے فرقان کے منہ پر پھر ایک عدد تھپڑ رسید کیا۔ "یہی کہنا چاہتے ہونا۔"

اس دفعہ فرقان صرف اس قدر کہہ سکا۔ "جی نہیں!"

وہ ڈانٹ کر بولا۔ "پھر وہی جی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے یوں کام نہیں چلے گا تم ابھی ٹھیک ٹھیک سب کچھ بتا دو گے۔" اس نے قریب ہی میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کا رسیور اٹھایا اور ایکس چینج سے تھانہ کا نمبر پوچھنے لگا۔ فرقان ایک بارگی بے حد پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا اگر معاملہ پولیس تک گیا تب تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ وہ گڑگڑا کر بولا۔

"آپ میری بات تو سنیئے!"

اُس نے رسیور رکھدیا۔ "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ خوشامد کرنے لگا۔ "آپ یقین جانیئے میں چور نہیں ہوں"

اس نے ایک لمبی سی 'ہُوں' کی اور ترس کھانے کے سے انداز میں کہنے لگا۔ "صورت سے تو بھلے آدمی لگتے ہو۔ کیا کرتے ہو تم؟"

فرقان سٹپٹا گیا کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ رُک رُک کر کہنے لگا۔ "جی میں، آجکل ——" وہ شخص خود ہی بول پڑا۔

"بے روزگار ہو"

"بہت عرصے سے" فرقان اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ذرا دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے میز کی دراز کھولی پہلے اس میں سے ریوالور نکال کر میز پر رکھا۔ اس کے بعد دس دس کے تین نوٹ نکالے اور ان کو فرقان کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لو ان کو رکھ لو، میرا خیال ہے کہ تم کسی بڑے شہر چلے جاؤ' وہاں تم کو روزگار مل جائے گا"

فرقان نے چپ چاپ نوٹ لے لیئے اور گردن جھکا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ ایکا ایکی ریٹائرڈ پولیس افسر پھر گرجا۔ "مگر یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ اب جو تم کبھی اس سرحد میں نظر بھی آئے تو سمجھ لینا کہ سالے خاں جیل میں سڑا کر ماروں گا" فرقان نے جلدی سے جواب دیا۔

"اب ہرگز ایسا نہیں ہو گا"

ایک دفعہ اس شخص نے پھر لمبی سی 'ہوں' کی اور بگڑ کر بولا۔ "اُلّو کے پٹھے اب کھڑا میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جا یہاں سے دفان ہو" اس کے بعد وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خود ہی دروازے کا بولٹ کھولا اور فرقان سے بولا۔

"چلو باہر آؤ"

فرقان کمرے سے باہر آگیا، اس کے پیچھے پیچھے وہ آدمی بھی تھا۔ بنگلے کے صدر دروازے تک آ کر اس نے دروازہ کھولا اور فرقان کی گردن پکڑ کر اس زور سے باہر کی طرف ڈھکیلا کہ وہ بجری پر

گرکر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

اس نے اُٹھ کر کپڑوں سے خاک جھاڑی مگر مڑ کر نہ دیکھا اور فوراً بنگلے کے لان سے باہر نکل گیا۔ چاند پر سے اب گرہن چھٹ چکا تھا۔ اجلی چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور ہوا میں کلیوں کی مہک تھی۔"

اب وہ ہوٹل پہنچا تو ندامت، ذلت اور پریشانی نے اس کو بے حد مشتعل کر دیا تھا مگر وہ یہ سارا غصہ نکالتا کس پر؟ پہلے تو وہ ہوٹل کے چوکیدار سے لڑا۔ پھر کمرے میں جا کر اس نے میز پر رکھے ہوئے شیشے کے گلاس پر خواہ مخواہ اس زور سے ہاتھ مارا کہ وہ دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا اور وہ خود ہانپتا ہوا کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر وہ اسی طرح تھکا ہوا پڑا رہا۔ پھر اُٹھ کر آئینہ کے سامنے گیا۔ اس کے چہرے پر خونخوار وحشت برس رہی تھی۔ لباس خاک آلود ہو رہا تھا۔ آئینہ میں اپنا عکس دیکھتے دیکھتے اس نے خود کو ایک موٹی سی گالی دی اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ اُلّو کے پٹھے تم نے یہ کیا حالت بنا ڈالی۔ سالے چلے تھے عشق کرنے۔ تمھاری سات پشتوں میں بھی کسی نے عشق کیا تھا۔ خواہ مخواہ مجنوں کے چچا بنے پھرتے۔ اُستاد آج تم جیل جاتے جاتے بال بال بچ گئے۔ اب صرف پاگل خانہ آباد کرنا باقی رہ گیا ہے۔

اس نے جیب سے تیس روپے کے نوٹ نکال کر میز پر ڈال دیئے، اور یہ ہے تمھارے عشق کی قیمت مبلغ تیس روپے۔ واہ بے ٹینی مرغ۔ بابا نہیں یہ بحث و حث تمھارے بس کا روگ نہیں اور سچ پوچھو تو تم کو اس کا بھی حق نہیں۔ مانا کہ تم محکمہ آبکاری کے انسپکٹر ہو اور تمباکو والوں سے اچھی خاصی رشوت بھی اینٹھ لیتے ہو مگر یہ جو ایک شے ہے محبت وہ بنگلوں اور کوٹھیوں میں پروان چڑھتی ہے، کاروں میں جوان ہوتی ہے اور بڑے بڑے عہدوں کے ساتھ شربت وصل کے مزے لوٹتی ہے۔ تم سے کس مسخرے نے کہا تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ مصیبت مول لے لو، لگی لگائی ملازمت بھی ہاتھ سے جائیگی پھر تو کوئی گھاس ڈالنے والا بھی نہ ملے گا۔ میاں صاحبزادے خیریت اسی میں ہے کہ واپس لوٹ آؤ، بہت آگے نکل گئے تھے۔ کیا سمجھے!

اور پھر سب کچھ فرقان کی سمجھ میں آ گیا۔

اس نے جھک کر پیر سے جوتا نکالا۔ بھائی یہ بھوت اس طرح نہیں اترے گا اور اس نے دھڑا دھڑ سر پر جوتے مارنا شروع کر دیئے۔ پہلے میں پہلے پہل تو ہاتھ تیزی سے چلتا رہا مگر جب سر بھنا گیا تو ہاتھ سست پڑنے لگا۔ اس نے جوتا اٹھا کر زمین پر پھینک دیا اور ایک بار پھر آئینہ میں اپنا حلیہ دیکھا۔ جوتے کی خاک اور بکھرے ہوئے بالوں نے اس کو بھوت کی طرح ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ اپنی یہ حالت دیکھ کر اس کو خود ہنسی آ گئی۔ یار میں واقعی پاگل ہو گیا تھا اور اسی حالت میں وہ جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔

بہت عرصہ بعد اس رات وہ بڑی گہری نیند سویا۔

سویرے اٹھ کر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا سامان بندھوانا شروع کر دیا۔ ۱۱ بجے جانے والی ٹرین سے پہلے پہلے وہ بالکل تیار ہو چکا تھا۔

ساڑھے ۱۰ بجے کے قریب اچانک سیما کا فون آیا۔ وہ کہہ رہی تھی "دیکھئے میں نے منع کیا تھا مگر آپ اپنی ضد سے باز نہ آئے"۔

فرقان نے بلا جھجک کر جواب دیا۔ "اور اس ضد کا انجام بھی دیکھ لیا"۔

وہ معذرت کرنے لگی۔ "میں تو ابھی ابھی سینی ٹوریم سے واپس آئی ہوں۔ رات ممی کے پاس ٹھہر گئی تھی۔ اس حادثہ کے ذکر سن کر مجھکو بے حد تکلیف پہنچی ہے۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں، جو چاہے سزا دے لیجیے"۔

وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ کہنے لگا۔ "بھئی اب اپنے میں ہمت نہیں۔ ابھی تک سر دکھ رہا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اس بھوت کو اتارا ہے۔ فی الحال تو خدا حافظ"۔

وہ جلدی سے بولی۔ "تو کیا آپ جا رہے ہیں؟"

"اب تو سامان بھی بندھ چکا، صرف ٹیکسی کا انتظار ہے"۔

اس نے بڑے پیار سے ڈانٹ کر کہا۔ "نہیں تم اس طرح نہیں جا سکتے۔ فرقان تم میرا انتظار کرو میں خود تمہارے پاس آ رہی ہوں"۔

اور فرقان کے جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے رسیور رکھدیا۔

فرقان پھر اُلجھن میں پڑ گیا۔ اس نے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ ابھی تک بالوں کی جڑیں دُکھ رہی تھیں اور ایک بارگی وہ بپھر گیا۔ ان سالی لڑکیوں کا سمجھنا اپنے بس کی بات نہیں، ذرا میں ناراض، ذرا میں مہربان، بالکل نٹوں کے سے کرتب دکھاتی ہیں، کبھی الٹی قلابازی، کبھی سیدھی اور یہ شمّا تو اچھا خاصا پیچیدہ معمہ ہے۔ نابابا اب اپنے میں زیادہ ہمّت نہیں ذکری کا مسئلہ الگ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لڑکی تو اب کوئی نئی آفت پیدا کر کے رہے گی۔ اس دفعہ وہ سالا پولیس والا مشٹنڈا مجھکو ضرور جیل بھجوا کے رہے گا۔

اس نے جلدی سے ٹیکسی بلوائی، سامان لدوایا اور اسٹیشن کی جانب چلدیا۔

ٹرین میں سوار ہو کر اس پر کیا گزری۔ اس بات کا لگانا ہو تو کبھی جوا کھیل کر دیکھئے۔

حمید کاشمیری

مکان

اس مکان کے مل جانے پر میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو تو نہیں آئے البتہ مجھے اپنی قسمت پر رشک ضرور آنے لگا۔ رشک کیسے نہ آتا۔ جو مشکلات مجھے یہ مکان حاصل کرنے سے پہلے پیش آئی تھیں ان کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ سال بھر تو میرا عجیب و غریب قسم کے دلالوں سے سابقہ پڑتا رہا۔ سینکڑوں پیالیاں چائے کی پلائیں اور ہزاروں سگریٹ۔ اس کے بدلے میں انھوں نے مجھے بیسوں مکان دکھائے اور پچاسوں ناکامیاں۔ مکان کوئی ڈھنگ کا ملا نہیں۔ اگر ملا تو دام ہیبت ناک۔ یہ مکان جس کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اگر کسی اور مقام پر واقع ہوتا تو ممکن ہے میں اسے باہر سے دیکھ کر ہی واپس چلا جاتا کیونکہ اس کی چھت کھپریل کی تھی اور دیکھنے میں نہایت ہی خستہ معلوم ہوتی تھی لیکن خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی کہ ایسی سڑک پر واقع ہے جسے ہم اس شہر کا دل کہتے ہیں، جس پر سے ہر آدمی فخر کے ساتھ گزرتا ہے، جو بڑے بڑے مہمانوں کی آمد پر سال میں کئی بار دلھن کی طرح سجائی جاتی ہے اور لوگ خوش آمدید کہنے کے لئے دن دن بھر دو رویہ قطاروں میں کھڑے آنے والوں کا انتظار کرتے ہیں اور یہ شہر تو پاکستان کا دل ہے ہی، اس میں آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لہٰذا میں نے مکان کو اندر سے دیکھ لینا بھی مناسب سمجھا۔ اور جب اندر سے دیکھا تو دل کے کنول کھل گئے اور شکر کیا کہ کہیں نیچے سے ہی دیکھ کر واپس نہ چلا گیا۔

اس وقت اس مکان میں ایک ریٹائرڈ جج صاحب رہتے تھے جنھوں نے اسے بڑے اہتمام سے سجا رکھا تھا۔ اگر اس کے تینوں کمرے آگے پیچھے تھے تاہم بہت بڑے تھے اور چونکہ رخ مغربی سمت تھا اس لئے اندر کمروں میں ہوا اتنی تیز تھی کہ کھڑکیوں میں ٹنگے ہوئے پردے تو کیا، سر کے بال

تک اڑنے لگتے۔ ایسا ہوادار اور اتنا بڑا فلیٹ اس سڑک پر مشکل ہی سے مل سکتا تھا اور پھر طرہ یہ کہ اتنی گنجان آبادی میں بھی الگ تھلگ! نیچے ایک بہت بڑی قالین کی دوکان تھی اور اوپر یہ تنہا فلیٹ۔ ہوادار اور پردے دار!

مکان تو مجھے پسند آگیا۔ مگر اب پگڑی سننے کی ہمت نہ تھی اور جب سنی تو ہمت بھی پیدا ہوگئی قیمت اتنی کم کہ میں اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ دلال نے مجھ سے کہا یہ تو جج صاحب نے محض اپنی لاگت مانگی ہے اور بات بھی ٹھیک تھی۔ اتنی قیمت پر تو دور دراز کے معمولی گھٹیا اور تنگ فلیٹ بھی نہیں مل سکتے تھے۔ میں نے مزید انتظار خود کیا نہ ریٹائرڈ جج صاحب کو کرنے دیا اور نہ دلال کو۔ بس جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔ ادھر مکان دیکھا اور ادھر سودا کر لیا۔ جج صاحب کی صرف ایک خواہش تھی کہ مکان لینے والی پارٹی شریف ہو۔ یعنی ہم لوگ شریف ہوں تاکہ بعد میں مالک مکان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔ میں نے اپنی شرافت کا یقین دلایا اور ذمہ داری دلال نے لی جو سودا کروا رہا تھا۔ جج صاحب کو اطمینان ہوگیا۔ پھر میں نے ویسے ہی ان سے مکان چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ وہ حج کو جا رہے ہیں اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں ہی رہیں گے۔ پھر ہم مکان میں داخل ہو گئے اور جج صاحب جو حج کو جا رہے تھے خارج۔ ان کا سامان دو گاڑیوں میں لادا گیا لیکن ہم نے جو دعائیں انہیں دی تھیں وہ دس گاڑیوں میں بھی نہیں سما سکتی تھیں۔ میری بیوی کہنے لگیں۔ "پرانے زمانے کی شرافت اب بھی دنیا میں باقی ہے" اور میں نے تائید کی۔ بہر حال جج صاحب چلے گئے لیکن اپنی شرافت کا سکہ ہمارے دلوں پر بٹھا گئے۔

ہم جب اپنا سامان وغیرہ پوری طرح قرینے سے لگا کر اس گھر میں خوشی و خرم طریقے سے آباد ہو گئے تو اس وقت محسوس ہوا کہ مکان کے پچھلے کمرے میں روشنی نہیں آتی۔ ہم نے روشنی کی خاطر برابر والی کھڑکیاں کھولنی چاہیں لیکن وہ بہت سخت جام ہوگئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب سے مکان بنا ہے کھڑکیاں بند ہیں۔ بڑی مشکل سے ہتھوڑے مار مار کے کھڑکی کھولی۔ اس کے کھلتے ہی روشنی تو خیر جو آئی سو آئی لیکن بدبو کے جھکڑ سے چلنے لگے اور مچھروں کی بوچھار آن گری۔ ایک دم ناک سڑنے لگی اور بیوی کی طبیعت بری طرح متلانے لگی۔ میں نے جلدی سے

کھڑکی بند کردی اور اوپر سے ہتھوڑے مار مار کے دردیں بٹھا دیں۔

میری بیوی نے جج صاحب کو جو جج پر گئے ہوئے تھے، چند بڑے ہی سنگین کلمات سے یاد کرکے ان کی شرافت کے مجسمے کو توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے "جج صاحب" کی وکالت کرکے وقتی طور پر اس مجسمے کو ٹوٹنے سے بچا لیا۔ میں نے بیوی کو قائل کر لیا کہ آخر اس میں جج صاحب کا کیا قصور ہے۔ بدبو اور مچھر باہر سے آئے ہیں۔ کیوں نہ دیکھ لیا جائے کہ اس کے اسباب کیا ہیں؟ پچھلی طرف جو صحن تھا اس کے باہر والے دروازے سے صرف بھنگی آیا جایا کرتا تھا۔ ہم نے اس دروازے کو کھول کر حالات معلوم کرنے چاہے۔ لیکن وہ دروازہ انتہائی تاریک اور گندی گلی میں کھلتا تھا۔ اس لئے ہم نے اسے پھر بند کر دیا اور بھنگی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ بھنگی آیا تو اس نے بتایا کہ اس گلی میں کبھی کسی آدم زاد کا گزر نہیں ہوا اور اس میں صدیوں کی غلاظت اور گندگی کے انبار پڑے سڑ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے فلیٹ سے جو استعمال کا پانی باہر جاتا ہے وہ بھی اس گلی میں گرتا ہے اور نیچے گٹر کا کوئی انتظام نہیں۔ گٹر کا مسئلہ تو خیر دوسرا تھا۔ پہلا مسئلہ جو ہمیں درپیش تھا وہ پانی کا تھا جس کے لئے گٹر کی ضرورت محسوس ہوتی۔

جج صاحب نے ہمیں بتا دیا تھا کہ مکان میں پانی نہیں ہے لیکن ہم نے مکان کے محل وقوع کے پیش نظر اسے بغیر پانی کے ہی قبول کر لیا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ جس طرح جج صاحب گزارا کرتے رہے ہیں اسی طرح ہم بھی کر لیا کریں گے۔ جج صاحب کیسے گزارا کرتے تھے۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ بھنگی نے بتایا کہ وہ صرف دو میاں بیوی تھے اور چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بالٹی پانی کی استعمال کرتے تھے اور یہ بالٹی جج صاحب صبح پانچ بجے سامنے والے کمپاؤنڈ سے بھر کرلے آتے تھے اور جب کبھی غسل کرنا ہوتا دو بالٹیاں لے آتے تھے لیکن ہمیں تو ایک ٹینکی پانی کی روز درکار تھی۔ اس سلسلے میں جب ہم نے ماشکیوں سے رجوع کیا تو وہ صاف انکار کر گئے۔ دراصل ہمارے فلیٹ میں پانی بھرنے سے انھیں بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ ایک تو تینوں طرف سے باہر کا برآمدہ طے کرنا پڑتا اور پھر تین کمرے عبور کرکے پچھلی طرف غسل خانہ آتا تھا جس میں پانی ڈالا جاتا۔ غور سے دیکھئے یہ ان تینوں کمروں کی طوالت ایک ریل گاڑی کی سی لگتی تھی۔ لہٰذا کوئی بھی ماشکی پانی بھرنے کے لئے

تیار نہ ہوا اور میں بیٹھے بٹھائے جج صاحب بن گیا یعنی صبح پانچ بجے اُٹھ کے سامنے والے کمیاؤنڈ کے نلکے سے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے لاتا رہا۔ ایک ہفتہ لگاتار یہ مشق کرنے سے محسوس ہوا کہ مجھے دمے کی بیماری ہوگئی ہے اور اگر نہیں ہوئی تو ہونے والی ضرور ہے۔ اس دن بھر میں نے ماشکیوں کی منت سماجت کی۔ آخر کار ایک ماشکی کو مجھ پر ترس آگیا۔ وہ آٹھ آنے فی مشک دینے پر رضامند ہوگیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے صدیوں کا لدا ہوا بوجھ سر سے نیچے اُتار دیا ہو۔

پانی کا مسئلہ حل ہوا تو ایک ہفتے بعد یہ انوکھی بات محسوس ہوئی کہ جب ہم چلتے ہیں تو مکان ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل جاتا ہے یعنی اس طرح جیسے کوئی ہلکا ہلکا زلزلہ آرہا ہو۔ یہ بات تو میں نے پہلے بھی محسوس کی تھی لیکن شدت سے اس لئے نہیں کہ ایک تو پانی کی مشکل حل کرنی تھی۔ دوسرے جس دن ہم نے بند گھر کی کھولی تھی اس دن بدبو کے ساتھ مچھروں کا ایک جم غفیر اندر گھس آیا تھا اور اس دوران میں ہم پانی کا مسئلہ حل کرنے اور مچھر مارنے میں مصروف رہے تھے۔ خیر مچھر تو کسی حد تک ختم ہوگئے۔ اس لئے کہ اوپر ہوا بہت چلتی تھی اور پانی کے لئے ماشکی کا خدا بھلا کرے! چاہے اٹھنی مشک ہی پر رضامند ہوا، ہوا تو سہی۔ لیکن اب مکان کے لرزنے سے ہمارے دل بھی لرزنے لگے۔ مرد تو خیر حوصلہ کر ہی لیتے ہیں لیکن بیوی کا یہ عالم تھا کہ دن میں بیس بیس مرتبہ بہ آواز بلند کلمہ پڑھتی۔ میں نے کہا چلو یہ بھی اچھا ہے۔ اسی بہانے خدا اور رسول کو تو یاد کرتی ہیں۔ اس پر وہ چڑھ گئیں اور ان کی بجائے جج صاحب کو سو بتروں سے یاد کرنے لگیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بیوی نے جج صاحب کے شرافت کے مجسمے کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیا۔ میں نے بھی جج صاحب کی وکالت کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ کسی حد تک بیوی ہی کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اب چوبیس گھنٹے ہمیں بلڈنگ لرزتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ مالک مکان کی حالت مکان سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ بلدیہ سے رجوع کرتے تو مکان کو خطرناک قرار دیدیا جاتا اور ہمیں خالی کرنے کا نوٹس مل جاتا اور ساری رقم ڈوب جاتی لہٰذا مجبور ہوکر صبر کرلیا اور فرش جو پاؤں کے نیچے تھا اس کا خطرہ سر پر سوار ہوگیا۔ خطرہ کا مقابلہ کرنے کی تاب تو تھی نہیں لہٰذا میں نے پھر

دلالوں سے رابطہ قائم کر لیا اور ایک آدھ پارٹی خریدار بن کر روز میرا مکان دیکھنے کے لئے آنے لگی لیکن مکان کم دیکھتی اور باہر بالکونی میں ٹھہر کر نیچے بارونق سڑک کا نظارہ زیادہ کرتی جو ہمیں کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اس لئے کہ مکان کی اصلیت جاننے کے بعد نظارے میں ہمارے لئے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔

اسی طرح کئی پارٹیاں آئیں لیکن تھوڑی دیر بالکونی سے نظارہ دیکھکر چلی گئیں۔ دلال جس نے یہ مکان دلوایا تھا اب پارٹیاں لانے میں بہت سرگرمی دکھا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے مکان فروخت کرنے کی وجہ تک نہ پوچھی۔ البتہ لوگوں کے سامنے مکان کی تعریف اسی انداز سے کرتا تھا جس طرح خریدنے سے پہلے میرے سامنے کیا کرتا تھا۔ ہم مکان فروخت کرنے کی کوشش میں مصروف ہی تھے کہ ایک دردناک خبر ملی یہ کہ ہمارا پانی بھرنے والا ماشکی مر گیا ہے۔ ہم نے ماشکی کے مرنے کا یوں افسوس کیا جیسے وہ کوئی ہمارا عزیز ہو۔ یہ بھی ہماری خود غرضی کی علامت تھی۔ اس کے بعد کوئی ماشکی ہمارے گھر میں ایک روپیہ فی مشک کے حساب سے پانی لانے کو تیار نہ ہوا۔ ماشکیوں کا خیال تھا کہ مرنے والا ماشکی دمے کا مریض ہو کر مرا ہے اور یہ دمہ اسے ہماری سیڑھیاں چڑھنے میں برآمدے کا چکر کاٹنے اور فلیٹ کے ریل نما کمرے عبور کرنے سے ہوا ہے۔ واللہ اعلم یہ کہاں تک سچ ہے لیکن پھر ہمیں کوئی پانی ڈالنے والا نہیں ملا۔ ہم بوند بوند پانی کو ترسنے لگے۔ اور ترس ہی رہے تھے کہ خدا نے سن لی اور گھر کے اندر پانی ہی پانی ہو گیا۔

قریباً نصف رات ہو گی کہ ساون کی پہلی جھڑی شروع ہو گئی۔ چھت نے جگہ جگہ سے ٹپکنا شروع کر دیا اور سامان بھیگنے لگا۔ ہم سامان کو بچاتے، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے۔ جہاں کہیں بھی ٹپکنے کے آثار نہ ہوتے لیکن کہاں تک۔ تھوڑی ہی دیر میں فلیٹ کے اندر چھ چھ انچ پانی جمع ہو گیا۔ پہلے تو چھت ٹپک رہی تھی، اب پرنالے چلنے لگے۔ جہاں تک چادریں وغیرہ ڈال کے سامان کو بچایا جا سکتا تھا۔ ہم نے اسے بچانے کی کوشش کی، لیکن سب بیکار۔ آخر ناامید ہو کر کوشش ہی ترک کر دی۔ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ باہر گھپ اندھیری رات میں بجلی زور شور سے چمک رہی تھی، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور ہم اندر سکڑتے سکڑتے درمیان

والے کمرے میں ایک چارپائی پر سمٹ کے بیٹھ گئے تھے۔ پانی باہر کم اور اندر زیادہ برس رہا تھا۔ تمام کمرے تالاب کی طرح بھر گئے تھے۔ صرف یہی ایک چارپائی کسی حد تک محفوظ تھی جہاں پانی نسبتاً کم ٹپک رہا تھا۔ اس رات ہمارے گھر میں پانی اتنا تھا کہ سب اگلی پچھلی کسریں نکل گئیں۔ پانی کی قلت کا مسئلہ فوراً ختم ہوگیا۔ ہم نے ماشکی کو بھلا دیا اور اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ بیوی زور زور سے کلمہ پڑھ رہی تھیں اور چڑچڑے پن سے جج صاحب کے عزیزوں تک کو نام لے لے کر یاد کرنا شروع کر دیا۔ میں نے خطرے کو جب بہت زیادہ قریب دیکھا تو پھر وہ بدبو والی کھڑکیاں کھول دیں اور پانی کی کڑاھیاں بھر بھر کے کھڑکیوں سے باہر پھینکنے لگا۔ اس وقت ہمیں بدبو، سڑاند اور مچھروں کا قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ تمام رات میں نے پانی باہر پھینکتے ہوئے اور بیوی نے جج صاحب کو خطابات پیش کرتے ہوئے گزاری۔

صبح بارش تھمی اور دھوپ نکل آئی تو ہم نے بھنگی کو بلوا کر سارا مکان صاف کروایا اور پھر کئی روز تک گھر کے سامان کو دھوپ میں رکھ کر سکھاتے رہے۔ اس عرصہ میں مکان کی اندر سے یہ حالت ہوگئی تھی کہ آسیب زدہ معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا ہمارے موقع شناس دلال نے جو اپنے پیشے میں ثانی نہیں رکھتا تھا اس دوران میں کسی پارٹی کو مکان دیکھنے کی دعوت نہیں دی۔ میں نے دل پہ ضبط کر کے کچھ رقم اور خرچ کر ڈالی اور مکان کی اندر سے بہت اچھی ٹیپ ٹاپ کرا دی۔ اس طرح کرٹپکنے کا ایک نشان بھی کہیں چھت یا دیوار پر باقی نہ رہا۔

ایک دن دلال نے بڑے وثوق سے کہا کہ اب جو پارٹی آئے گی وہ سو فیصدی خریدنے والی ہوگی۔ میں نے کہا، ایسی پارٹی کو لانے کا ایک دن مقرر کر لو۔ دلال نے دن مقرر کر لیا اور میں نے پارٹی کی آمد سے ایک دن پیشتر ہی تینوں کمروں کو رئیسانہ طریقے سے سجا دیا۔ چاروں طرف کھڑکیوں اور دروازوں پر خوبصورت ریشمی پردے ٹانگ دیئے اور جب پارٹی، جو صرف ایک آدمی پر مشتمل تھی، ہمارا مکان دیکھنے آئی تو ہمارے گھر کی فضا بڑی پُروقار معلوم ہو رہی تھی۔ ہم نے دُلھن کی طرح سجے ہوئے تینوں کمروں میں اگربتیاں سلگا رکھی تھیں اور سنگھار میز پر رکھی ہوئی عطر کی شیشی نجانے کیسے الٹ گئی تھی کہ ہلکی ہلکی خوشبو تمام کمروں میں پھیل گئی تھی۔ پارٹی اتنی متاثر

ہوئی کہ اس نے مکان کو نہایت ہی سرسری طریقے سے دیکھا جیسے کوئی گاہک معمولی سبزی ترکاری کو دیکھتا ہے۔ ہم لوگ پارٹی کے ساتھ باہر کے ہوادار کمرے میں بیٹھ گئے اور نہایت دوستانہ ماحول میں گفتگو ہونے لگی۔ اسی گفتگو میں مکان کا سودا بھی ہوگیا۔ اور پارٹی نے بیعانہ دیدیا۔ سودا میری لاگت سے اوپر ہی ہوا تھا لیکن دلال اس وقت میری وکالت کر رہا تھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ پارٹی کو یقین دلا رہا تھا کہ ہم نے منافع نہیں لیا بلکہ صرف اپنی لاگت پر سودا کیا ہے نیز یہ کہ ہمیں منافع سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ پارٹی شریف ہو تاکہ آئندہ مالک مکان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔ جواب میں پارٹی نے اپنی شرافت کا یقین دلایا اور دلال نے حسب معمول ذمہ داری لی۔ میں بھی جج صاحب کی طرح مطمئن ہوگیا۔ پھر پارٹی نے مجھ سے مکان چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا "حج کو جا رہے ہیں اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں ہی رہنے کا ارادہ ہے"۔ ہماری یہ گفتگو جس دوستانہ ماحول میں شروع ہوئی تھی اسی میں ختم ہوگئی۔۔۔ جاتی دفعہ ہم نے پارٹی سے مکان خالی کرنے کے لئے چار دن کی مہلت مانگ لی۔

چوتھے دن صبح جب ہمارا سامان جا چکا تھا اور مکان کو ہم نے اس طرح صاف کرایا جیسے وہ چٹیل میدان ہو۔ خیر خریدار بھی آگیا اور دلال کے روبرو اس نے بقایا تمام رقم ادا کر دی۔ ہم مصافحہ کر کے رخصت ہوگئے۔ اس وقت ہم بہت اداس تھے اور خریدار ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ میری بیوی اس بات سے بہت متاثر ہوئیں۔ چلتے چلتے کہنے لگیں "کتنا شریف آدمی ہے؟"

میں نے کہا "جی ہاں، آئندہ سال یہ بھی حج کو جائے گا اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں آکر اُترے گا"۔

محمد عمر میمن

رشوت

وہ شام زندگی کی بہت عجیب شام تھی۔

..... ان شاموں میں سے جب زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما ہوتا ہے جو جیون کی سڑک پر یکہ وتنہا ایک سنگِ میل بن کر ایستادہ ہو جاتا ہے۔ ایک بھرپور زندہ نشانی۔ وہ سنگِ میل پھر زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایسے ہی، دیکھو جہاں میں کھڑا ہوں۔ اس سے پہلے کی زندگی بہت معمولی تھی، اور آگے ..... تنویر ہے، مسرت ہے اور آفاقی ہنسی ہے۔

وہ شام ماسی کی زندگی کی ایسی ہی ایک شام تھی۔ اس دن ماسی نے اپنی دانست میں اپنی زندگی کا سب سے عظیم تجربہ حاصل کیا تھا۔ اس دن ماسی کو یک لخت اپنے مکمل تجربہ کار ہونے کا الہام ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گدلے دیوں میں اچانک اعتماد بڑے پن اور نہایت اہم بن جانے کی جوت سمٹ آئی تھی۔ اس ایک دن میں بڑے پن کی وہ کتنی منزلیں طے کر گئی تھی۔

اس شام ماسی نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔

نقوی پارک میں پروین اور احمد کی ملاقات کا بندوبست کر کے ماسی ٹھیک اسی لمحے انکے درمیان آدھمکی تھی جب وہ پھولوں کے ایک حسین کنج میں تشنہ محبت کے ہار سنگار سجانے والے والے تھے ..... سردیوں کی اجاڑ خشک سی شام۔ پھولوں کا بیچ، اور ایسے جاوداں، با محل لمحے میں یوں ماسی کا ان کے خلوت کو مکدر کرنا، جھنجھلائے تو بہت لیکن حکمت عملی کام آگئی سر پڑی بلا کو ٹالنے کے لئے ادھر پروین کے اپنا گرم کوٹ اتارا جس پر مہینوں سے ماسی کی آنکھیں گڑی

تھیں حتیٰ کہ دبی زبان سے دو چار بار فرمائش بھی کر دی تھی ۔ ادھر احمد نے جیب کی ساری نقدی ماسی کی ہتھیلی پر الٹ دی ۔

ایسے موقعے تو روز ہی ماسی کی زندگی میں آتے تھے چھوٹے موٹے تحائف روز ہی مل جاتے اور کسی دن اتفاق سے اس کی جھولی خالی بھی رہتی تو وہ اس دن کو اپنے لئے منحوس متصوّر کرتی ۔ گرما کی تعطیلات کے بعد جب کالج نیا نیا کھلتا اور تازہ بتازہ داخلوں کی ریل پیل ہوتی تو ماسی کا کاروبار ذری کی ذری ٹھنڈا پڑ جاتا ۔ لیکن وقت کے ساتھ اب اسے کمائی کے گر آ گئے تھے ۔ آنکھوں میں کاروباری چمک لئے وہ تاجرانہ سوجھ بوجھ کے ساتھ نئی لڑکیوں میں اس طرح گھل مل جاتی کہ ان کا کوئی راز راز نہ رہتا بلکہ کنوارے بے تاب سینوں سے مثل سیماب جھلک کے ماسی کے اندھے سینے میں دفن ہو جاتا ۔ محبت کی صبحیں ، جذبات کی شامیں بہت دلنواز ہوتیں ۔ عہد و پیمان کے چلر پھر چل نکلتے اور ان کی ہر گردش کے ساتھ ماسی کا کشکول کھنکھناتے سکوں کے جلترنگ سے بھر جاتا ۔ ماسی کے کھردرے ہاتھوں سے گزر کر رحیمہ کے گدرائے جسم تک آتے اور اس میں تازگی ، شگفتگی اور لوچ کا اضافہ کر دیتے ۔ ایسے قاتل لمحوں میں ، رحیمہ کو اپنی راتوں کی اجاڑ تنہائیوں کا احساس غمزدہ کر جاتا لیکن آج کا موقع اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ تھا ۔ آج بلاشبہ کافی مالِ غنیمت ہاتھ لگا تھا ۔

اور اب ماسی شاداں و فرحاں کسی جیتے ہوئے جواری کا خمار لئے گندے نالے کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتی جا رہی تھی ۔ راستے میں طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں قلابازیاں کھاتے رہے ۔ ۔ ۔ جانے کیسے آج اس کے ذہن میں رحیمہ کی شادی کا خیال آ گیا تھا ۔ اسے گردوپیش کا کچھ احساس نہ تھا ۔ یہاں تک کہ بتدریج ڈوبتی شام آخری ہچکی لے کر رات کی گنہگار باہوں میں ڈھیر ہو گئی ۔ اور سڑک پر مقررہ فاصلہ سے ایستادہ لیمپ پوسٹ برقی قمقموں سے روشن ہو گئے ۔ اس کا دھیان کہیں نہ تھا اور قدم کسی دبے شعور کے سہارے خود بخود منزلِ مقصود کی طرف رواں تھے ۔ آج اسے خلافِ معمول بہت دیر ہو گئی تھی ۔ لیکن دیر سویر کا اسے احساس ہی کہاں تھا ۔ وہ آج بہت خوش تھی ۔ سردی سے اس کے دانت کٹکٹانے لگے لیکن اس نے پروا نہ کی

ماسی ایک مقامی کالج میں ملازم تھی ۔

اس کی نوکری تو صرف اس قدر تھی کہ لڑکیوں کے کامن روم کے آگے اسٹول ڈالے ان کی کڑی نگہداشت کرتی رہے۔ انھیں بے مقصد لڑکوں سے دیر تک گفتگو کرنے سے باز رکھے یا اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی سے بات کرنا چاہے تو وہ اسے دروازے پر ٹھہرا کر مطلوبہ لڑکی کو بلا دے۔ یا لڑکیوں کی فرمائش پر آس پاس کی دکانوں یا کالج کی کینٹین سے ان کی مطلوبہ چیزیں لا دے.... تنخواہ بھی اسے اسی بات کی ملتی تھی لیکن اپنی ذمہ داری کو جس طرح ماسی نے سمجھا اس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی....... وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتی کہ کب کوئی لڑکی یا کوئی لڑکا ایک دوسرے میں دلچسپی لیتے ہیں تاکہ وہ اپنا پانسہ پھینک سکے۔ ملاقات سے باز رکھنا تو رہا ایک طرف، وہ اندرونِ کالج یا بیرونِ کالج ان کی ملاقات کے مواقع فراہم کرتی۔ گھنٹہ لگتے ہی جب لڑکیاں کلاسوں کی ہو رہتیں تو اسٹول چھوڑ چھاڑ گھڑی دو گھڑی میدان صاف پاکر اپنے یاروں (جو آس پاس کے خوانچہ فروش اور دکانداروں پر مشتمل تھے) کے پاس بیٹھ آتی۔ یا ایک آدھ چکر دور افتادہ جھاڑیوں کا لگا آتی۔ کیا پتہ کوئی شکار پھنسنے کا منتظر بیٹھا ہو۔

ان جھاڑیوں کی بھی ایک کہانی تھی۔ مخصوص لب و لہجہ کے ساتھ عملی طور پر پیش آنے والی ایک مختصر لیکن جاندار کہانی۔ ان جھاڑیوں کا بھی ایک کردار تھا۔ یہ جھاڑیاں جو کالج کے ایک اجاڑ سے دور افتادہ گوشہ میں زمانے کی بے اعتنائی کے سبب از خود جی اور پھل پھول رہی تھیں۔ ..... جس طرح برگد کے پیڑ تلے گیان دھیان کے اذیت ناک مراحل سے گزر کر بدھ کا سینہ نورِ عرفاں سے جگمگایا تھا۔ بالکل اسی طرح ان جھاڑیوں کی چھدری چھاؤں میں ماسی نے خود آگہی کے مراحل طے کئے تھے یہیں اس کی زندگی نے اپنا چولا بدلا تھا۔

ماسی جگ ماسی تھی اور تو اور خود اپنے محلہ میں وہ اس نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ کالج کی نوکری سے پہلے وہ سگریٹ سازی کے کسی کارخانے میں ملازم تھی۔ جب محلے کی عورتیں، کنواری بالیاں، بچے، غرض گندے نالے کے گرد اگرد بے ہنگمی سے پھیلی ٹاٹ، پھونس اور ٹین کے مسقف جھگیوں پر مشتمل پوری کی پوری آبادی اسے چچی نصیبن کے نام سے پکارتی تھیں، لیکن ادھر تین سال سے کالج کی نوکری اس نے کیا کر لی تھی کہ وہ جگ ماسی بن کر رہ گئی تھی۔ چچی نصیبن

۲۵ سال کی بدہیئت بیوہ، زمین پر پھوٹے نصیب لے آنے والی، بڑی تیزی سے موجودہ ماضی کی شخصیت میں ضم ہو کر رہ گئی تھی۔

اور ان جھاڑیوں کی بھی الگ اپنی مخصوص کہانی تھی ــــ

گرمیوں میں عموماً ماسی کے جسم پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے ہوتے (جو لڑکیاں مطلب برآری کیلئے تحفتاً یا رشوتاً اسے دیا کرتیں) اور سردیوں میں ایک خوب لمبے اور میلے سے کوٹ کا اضافہ اور ہو جاتا جواب سے تین سال قبل ماسی کو ملا تھا۔

ان جھاڑیوں اور کوٹ کی کہانی مشترک تھی۔ ایک غیر منقسم اکائی ــــ

یہ ان دنوں کی بات تھی جب ماسی ابھی زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ نہ ہوئی تھی۔ ایک روز وہ یونہی تجسسانہ دلچسپی سے کالج کے اسی دور افتادہ گوشہ میں نکل آئی تھی لیکن جب اس نے اس خرابے میں، گنجان جھاڑیوں کے عقب میں، رشیدہ پر اکرم کو جھکے دیکھا تو خاصا غل مچا دیا۔ نتیجتہً دو تشنہ روحیں جنم جنم کی ناسودگی کا احساس لئے گھبرا کر ایک دوسرے سے گریزاں ہو گئی تھیں۔ اگلے لمحے انہیں ماسی کے قدموں پر دیکھا۔ لالچ منتیں، اور خوشامد کائی زدہ دیوار پر گرتی بوندوں کی طرح ماسی پر سے پھسل گئیں۔ سادہ لوح ماسی (جسے آج اپنی عمر کے ۳۵ سال گزر جانے کے بعد یک لخت اپنے بے حد اہم ہونے کا احساس ہو رہا تھا) ٹس سے مس نہ ہوئی۔ خیر سے آس پاس کوئی موجود نہ تھا ورنہ ماسی کا غل غپاڑہ جانے کن زیادتیوں کا پیش خیمہ بن جاتا ــــ دونوں لرزہ براندام سہمے سمٹے ماسی کے حضور کھڑے تھے اور وہ کسی طرح قابو میں نہ آ رہی تھی۔ وہ مصر تھی۔ وہ ماسی ہی کیا جو حرام کے لقموں پر گزر اوقات کرے۔ اپنی وفاداری کا ثبوت دینے وہ پرنسپل سے رپورٹ کیے بنا نہ مانے گی، اور حقیقت میں اس کا منشا بھی یہی تھا لیکن جب رشیدہ نے اپنا قیمتی کوٹ اتار کر ماسی کے کپکپاتے وجود پر ڈال دیا تو جیسے اس نے نرم گرم لمس کی لذت سے اسے سکتہ ہو گیا، زبان گنگ اور ہونٹ سل گئے۔ بنا کچھ کہے اس نے کوٹ کو جھاڑیوں میں چھپایا اور سر جھکائے کالج کی طرف چل دی۔

اگر وہ اس وقت ان سے کچھ طلب کر لیتی تو انھیں بنا دئے چارہ نہ تھا۔ لیکن یہ ماسی

کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور اس کے ساتھ ہی ناتجربہ کاری کی تھرتھراہٹ بھی ناگزیر تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا اس اجنبی ماحول میں اسے کیا کرنا چاہئے۔ جو ملا اسی پر صبر و شکر کرتی وہ چھٹی کے بعد چھپتی چھپاتی جھاڑیوں تک پہنچی، کوٹ نکالا اور عقبی دروازے سے ہوتی ہوئی خوب لمبا چکر کاٹ کر ایک بالکل ہی مختلف راستے سے گھر پہنچی۔

راستہ بھر رہ رہ کر اسے یہ خیال ستاتا رہا۔ اسے یہ سب نہ کرنا چاہئے تھا لیکن قیمتی کوٹ کی گداز نرماہٹ کے لمس نے ہر بار آگے بڑھ کر اندر سے اٹھتی آوازوں کو قتل کر دیا۔ بے خیالی وہ چلتے چلتے کوٹ کی ملائم روئیں دار سطح پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتی تھی۔ کسی اندرونی سرخوشی سے وہ کوٹ کی نرم سطح تک اپنے ہونٹوں کو لاتی اور پھر چوم لیتی۔ جانے مسرت کا یہ جیتا جاگتا احساس اس شام کہاں سے اس کے ہونٹوں کے خمیدہ کونوں میں سمٹ آیا تھا۔

شروع کے چند ہفتوں میں ضمیر اور ذہن کی جنگ نے ماسی ادھ موا کر ڈالا۔

اور پھر اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنے اندر چھپی "نصیبن" کا گلا گھونٹ دیا جو بڑی مذہبی تھی اور رحم دل بھی۔

یہ روز کا معمول بن گیا تھا کہ وہ ارادتاً وقت بے وقت دو چکر جھاڑیوں کے ضرور لگا تی جہاں صرف چند روز پہلے کردار کی موت اور زیست کا عجیب ہنگامہ رونما ہوا تھا جہاں سب سے پہلے وہ خود آگاہ ہوئی تھی۔ جہاں پہلی بار اس نے خوش حالی لے لئے ایک لمحے کی دیوانگی میں بڑی درندگی سے ایک عورت کا قتل کیا تھا کبھی کبھار اسے خاطر خواہ کامیابی ہوتی۔ آپس میں جذب دو وجود دھنستے اور اب وہ اتنی دلیر ہو گئی تھی کہ جس کی جو چیز بھا جاتی کھڑے کھڑے دھر والیتی۔ لڑکیاں بھی ماسی کو سمجھ گئی تھیں، وہ اسے خوش رکھنے کے لئے ہزار جتن کرتیں۔

وقت کی سبک خرامی کے ساتھ ساتھ ماسی کا گھر طرح طرح کی چیزوں سے بھرتا گیا۔

ماسی کی ایک لڑکی تھی۔ جوانی کی دہلیز پر کھڑی رحیمہ نے جو اپنی ماں کے برخلاف خاصی حسین تھی۔ پہلے پہل تو ماسی کو بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا لیکن جب تحائف روز کا معمول بن گئے تو اس کی آنکھوں کا استفہام پگھل کر موم کی طرح بہہ گیا۔

ہر عورت کو اپنا شوہر عزیز ہوتا ہے اور پھر وہ اگر مر چکا ہو تو کچھ زیادہ ہی۔ رحیمہ سے ماسی کی والہانہ محبت ماں کی ممتا کے علاوہ بھی ایک اور ناطے سے تھی۔ وہ اس کے مرحوم شوہر کی واحد نشانی تھی جس کے خدوخال میں وہ دونوں ہی منعکس تھے۔ اکثر ماسی پہروں رحیمہ کو ٹکٹکی باندھے گھورتی۔ پھر والہانہ طور پر باہوں میں سمیٹ کر اس کے شہابی رخساروں کو پے در پے بوسوں کی یورش سے اور بھی گلنار کر دیتی۔

اسے خود ان تحفوں سے کیا سروکار تھا۔ اس عمر میں بوڑھی گھوڑی لال لگام بن کر خود کو شرمسار تو کرنا نہ تھا۔ وہ سب کچھ رحیمہ کے حوالے کر دیتی اور اسے صاف ستھری رہنے کی تاکید کرتی رحیمہ سجی سجائی چوتھی کی دلہن بنی رہتی اور تمام دن بے کار بیٹھے بیٹھے اس کا ذہن گھومتا رہتا لیکن ماسی کے پاس کچھ سوچنے کے لئے وقت نہ تھا۔ اس کی زندگی کی توجیسے حد بندی ہو گئی تھی۔ ان حدود کے انتہائی کناروں پر اس کا گھر اور کالج تھا۔ صبح تڑکے نکلتے تو شام ڈھلے گھر میں قدم رکھتی۔ شام کے اندھیرے اور صبح کی دھندلاہٹیں رحیمہ کی آنکھوں میں جھانکنے کے لئے ناکافی تھیں ان کے لئے دن کی روشنی درکار تھی۔ جو ماسی نے کالج کی دہلیز پر رکھ دی تھی۔

"بس اب ذرا یہ جاڑا گزر جائے تو رحیمہ کے ہاتھ جلد ہی پیلے کر دوں گی۔ ان سردیوں میں وہ پورے بیس سال کی ہو جائے گی!"

ملائم کوٹ کی ملائم ترسطح پر عجیب مسرت کے عالم میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ماسی نے سوچا۔ "کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے ہاتھوں رحیمہ کا دامن دینے سے رہی۔ خیر سے اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ ہے۔ ہزار بارہ سو کا زیور، پندرہ بیس جوڑی کپڑے۔ دو تین سو نقدی۔ ان سب کے بدلے داماد بھی تو کھاتا پیتا ہی ڈھونڈھنا پڑے گا!"

وہ رحیمہ کی شادی کے منصوبے بناتی چلی جا رہی تھی جانے آج کیسے یک بیک رحیمہ کی شادی کا خیال اس کے ذہن میں آ گیا تھا۔ مگر اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ شادی کے بعد رحیمہ اس کے شوہر کی واحد نشانی، ان دونوں کے عارضی سنجوگ کا سنگ میل، اس سے جدا ہو جائے گی۔ اس نے لرزاں آنسوؤں کی میلی میلی دھند کے

عقب سے کوٹ کی ملائمیت کو دیکھتے ہوئے بے اختیار چونک کر کہا۔ نہیں نہیں، میں رحیمہ کو اپنے سے جدا تو نہ ہونے دونگی۔ ایسا داماد تلاش کروں گی جو میرے گھر پر ہی رہ سکے۔ اب کونسا مجھے سو پچاس برس جینا ہے۔ آج مری کل دوسرا دن۔ یہ دو تین برس اکیلی جی کر کیا کروں گی میرا کون ہے رحیمہ کے سوا اُن کی آخری نشانی"

بے خیالی میں سامنے پڑے پتھر کو اس نے ٹھوکر مار دی۔ یکایک پیر کے انگوٹھے میں درد کی ٹیس سے کراہ کر وہ سب کچھ بھول بیٹھی۔

ہاتھوں میں جھولتا ہوا کوٹ جاندار ترین حقیقت تھا اور مٹھی میں بھینچے چند نوٹ مسرتوں کے ضامن۔

اس نے کوٹ کی سطح پر اپنے آنسوؤں کی نمی کو جوں ہی محسوس کیا، چونک کر ٹھٹھک کر کھڑی رہ گئی اور پھر اس احتیاط اور نرمی سے اس نمی کو اپنے دوپٹہ سے پونچھا جیسے وہ کوئی مقدس شے رہی ہو۔

پہلے کبھی کبھار اس کے دل میں جوں ہی اپنی موجودہ زندگی کا اچٹتا سا خیال آتا تو وہ کانپ کر رہ جاتی۔ دل پوری وحشت سے دھڑکنے لگتا اور گناہ کا ٹوٹا مبہم، مدہم سا احساس اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیتا۔ ایک غیر واضح خوف سے اسے کپکپی آجاتی۔ لیکن رفتہ رفتہ ماسی اپنے حال میں اسقدر دھنس گئی کہ برائی بھلائی کا کوئی تصور اب پاس نہ پھٹکتا۔ بس اسے کچھ ہوش تھا اور کچھ غرض تھی تو یہ کہ اپنا الّو سیدھا رکھے۔ حقیقت بھی یہی تھی جہاں نظروں کے تیر چلیں، آگ آگ میں سما جانے کو بے تاب ہو اور کتاب کے اوراق میں سلگتے جذبات بے اختیار جسم کے نشیب و فراز میں دھومیں مچائیں، بھبھک پڑیں، بہہ جائیں، وہاں ایک ماسی پر ہی کیا موقوف تھا کسی الّو کا الّو بھی سیدھا رہ سکتا تھا۔

اور اب تو وہ اس درجہ منجھ سی گئی تھی، کہ ایک ہی نظر میں ہر لڑکی کے آئینۂ دل کو برمے کی طرح کاٹ کر آر پار نکل جاتی۔ اس درجہ مشاق کہ اچٹتی سی نظر میں پہچان لیتی کون لڑکا اور کونسی لڑکی اس کے الّو کے حق میں فرشتۂ رحمت بن سکتے ہیں۔

"ماسی ڈیر! پلیز! اچھی ماسی، ذرا نجمہ کو تو بلا دینا اور لو یہ رکھ لو دوپہر کو کچھ کھا لینا۔"
"ماسی! وہ، وہ اگر کہیں طارق نظر آجائے تو بھیج دینا" دوپٹہ کا پلو دانتوں میں چباتی کوئی لڑکی شرماتے لجاتے کہتی تو وہ جھٹ طارق کو کہیں نہ کہیں سے گھیر گھار لاتی۔ فوراً کامن روم میں پھسل جاتی اور نجمہ کو اس کے عاشق کے پاس گھسیٹ لاتی۔

"ماسی تم بڑی بہادر ہو۔ اس سڑے سے کوٹ میں سردی نہیں لگتی تمہیں"، کبھی تمہید یوں ہی باندھی جاتی "ہاں ذرا محمود کو تو بلا لانا۔ ضروری کام ہے۔ اور ہاں کل یاد کر کے مجھ سے سوئٹر لے لینا۔ بہارا کیا ہے۔ مر جاؤ گی اور ہمیں ناحق تکلیف ہو گی۔ وہ اس "ضروری کام"، کی نوعیت خوب سمجھتی تھی۔ لیکن بس یہی ماسی کا کمال تھا کہ اپنے طرزِ عمل اور رکھ رکھاؤ سے اس نے کبھی اپنی آگہی کو دوسروں پہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ یہی تو خاص بات تھی۔ وہ کبھی کا راز فاش نہ کرتی، ممکن ہے وہ فطرتاً ایسی رہی ہو یا پھر کاروباری اصول —— ماسی کا سینہ تو ایسا بند تہہ خانہ تھا۔ جس کی ہوا تو ماسی کو بھی شاید نہ لگی ہو گی۔ اس میں داخل ہونے والا ہر راز تمام عمر کھلی فضا اور روشنی کو ترس جاتا۔ کیسے کیسے راز تھے جو اس کھیچی عورت کے نحیف سینے کے مقبرے میں مدفون و مامون تھے!

رات کا اندھیرا دور تک پھیلا ہوا تھا۔

ماسی نے چلتے چلتے سگارک کمر کوٹ کو اپنے ہاتھوں سے پھر محسوس کیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا ڈیڑھ دو سو کا یہ کوٹ اب تنہا اس کی ملکیت ہے۔ اس کوٹ کے لئے اسنے کیا کیا جتن نہ کئے تھے۔

رشیدہ کا رشوتاً دیا ہوا کوٹ آخر کار کثرتِ استعمال اور موسم کی شدّت سے گھس چکا تھا اور سردی کے خلاف ساری قوت مدافعت کھو چکا تھا۔ ادھر اس برس سردی بھی کچھ ادھار کھائے بیٹھی تھی۔

یہی تو وہ موسم ہوتا ہے۔ جب کالج، کالج کاہے کو اچھا بھلا راجہ اندر کا اکھاڑہ ہوتا ہے۔ دھند کے غلاف میں لپٹے سے انجبس سرد سرد لمحوں میں اس کے در و دیوار سے

رنگ حیات جنم لیتے ہیں۔ سرخ شہابی، تارنجی سبز! انہی لمحوں میں ماسی کا روبار چمکتا ہے۔ لیکن بہت ہوا تو کسی نے اپنی نئی نویلی محبت کے کومل پودے کو سینچنے کے لئے دل پر پتھر رکھ کر اپنا سوئٹر، پلوور، جیکٹ یا کوٹی ماسی کی نذر کر دی۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اب بھلا اس کے کھوکھلے جسم میں اتنی حرارت کہاں تھی جو یہ ہلکے پھلکے فیشن ایبل کپڑے اسے گرم رکھ سکتے۔ سرخی چھلکاتے جسم کی حرارت جس کے آگے سارے کپڑے ہیچ ہیں۔ وہ اس عمر اور اس صورت شکل کے ساتھ کہاں سے لاتی۔ عرصہ سے وہ سب جسموں پر منڈھے نرم ملائم اونی کوٹ بڑی للچائی نظروں سے دیکھ رہی تھی لیکن اتنی بڑی قربانی کون دیتا ہے۔ ماسی خاموشی سے موقع کی تاک میں رہی۔ جب پرند آپ ہی آپ پھڑپھڑا کر زیر دام آجائے گا۔

سردی کچھ اور بڑھ گئی۔ شمال سے آنے والی ہواؤں نے پورے شہر کو منجمد کر دیا۔ ماسی کو محسوس ہوا۔ اب جلد ہی کوئی انتظام کرنا چاہئے۔ ورنہ کسی صبح وہ گندے نالے سے کالج کے راستہ میں کہیں ڈھیر ہو کر رہ جائے گی۔

اس خیال نے ماسی کی ساری صلاحیتوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ بس تبھی اس نے پروین کا احمد سے زبردست رومان لڑوا دیا۔۔۔ وہ نازک معصوم لڑکی محبت سے کہاں آشنا تھی۔ احمد بار بار ملتا، مگر وہ بے حس! ماسی نے بھانپ لیا اور پروین کے دل میں محبت کی جوت جگائی۔ جب وہ جال میں آپھنسی تو ماسی نے کسی ماہر شکاری کی طرح بڑی چابکدستی سے رسی کھینچ لی۔ وہ کسمسائی تڑپی لاکھ منتیں کہیں احمد سے ملاقات کے لئے کیا کچھ نہ کیا لیکن ماسی نے تو جیسے قسم کھا رکھی ہو کہ دونوں کو ملنے نہ دے گی۔ جب محبت میں دیوانی ہو کر اپنے گلے کا ہار ماسی کی نظر کیا تو شفقتوں کے دریا امڈ پڑے۔۔۔۔ ماسی ڈھیل دے کر اس بار کچھ اس طور پر پھانسنا چاہتی تھی کہ بنا کوٹ لئے بات نہ بنے۔ وہ گڑیا لڑکی جو محبت کے درد کی کٹھن راہوں میں دم توڑنے کو تھی، مجبور ہو کر ماسی کے قدموں پر آرہی۔ ماسی ایک زمانہ دیکھے تھی۔ پہلی ملاقات کے بدلے کوٹ کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

ماسی اپنے خیالات کے عمیق سلسلوں میں گم اب گندے نالے کے بائیں کنارے پھیلی متعفن بستی میں داخل ہو چکی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہوا کا طوفانی دباؤ بے جینی سے پھیلی جھگیوں میں دفن ہو کر

رہ گیا تھا۔ یہاں زیادہ خنکی نہ تھی۔ ماسی نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ دانت بجنے بند ہوئے۔ اور اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھوں سے کوٹ کی ملائمیت کو محسوس کیا۔ بڑی محنت سے روئیں دار سطح پر انگلیاں پھیریں۔ اس کے قدموں میں کچھ اور تیزی آگئی۔ جیسے وہ زندہ ہے۔ تو صرف اس کوٹ کے سہارے! ان پیچ در پیچ گلیوں کی بھول بھلیوں سے ماسی کسی مشاق کی طرح راستہ طے کرنے لگی۔ پھونس اور ٹاٹ کے ارتباط سے بنی جھگیوں کے اندر سے لالٹین کی مدھم کمزور سی روشنی دھوئیں کے بادلوں سے ہوتی ہوئی گلی میں آرہی تھی گیلی لکڑیوں، کاغذ اور اپلوں کا دھواں فضا میں مسلط تھا۔ ماسی کی آنکھیں جلنے لگیں۔ وہ اللہ دیے کی جھونپڑی تک آپہنچی۔ پوری جھونپڑی تاریکی کے ساگر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

... ہلکی ہلکی مدھم مدھم سرگوشیوں کی آواز ماسی کے کانوں سے ٹکرانے لگی۔ وہ اپنی نئی نویلی دلھن کو لئے پڑا تھا اور خوش آمد کر رہا تھا شاید ـــــ سرگوشیوں کی سرحد تک آکر آپ ہی آپ ماسی کے قدم رک گئے۔ کھڑکی سے جھانکا لیکن وہاں روشنی کہاں تھی بس چند سرگوشیاں تھیں۔ جذبات کی سرشاری میں کہے جانے والے محبت بھرے الفاظ ...... اور ماسی دھیرے دھیرے ماضی میں کھو گئی کبھی وہ بھی جوان تھی۔ تب اس کا کریم اس سے کیسی کیسی باتیں کیا کرتا تھا کسی مانوس لذت سے اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو کر جلنے لگیں۔ مگر وہ کریم کی محبت کے تمام تابندہ چراغوں اللہ دیے کی چوکھٹ پر گل کر کے آگے بڑھ گئی۔

کوٹ زندہ اور ازلی حقیقت تھا اور اس کی موجودگی میں کچھ اور سوچنا جیسا پاپ!

اپنے گھر تک آتے آتے اس کے قدموں میں بلا کی تیزی آگئی۔ کوٹ پر اس کی گرفت سخت ہوگئی۔ "رحیمہ دیکھے گی تو پھول کی طرح کھل اٹھے گی!" اس نے سوچا اور اور اس کا دل انوکھی محبت سے تیز دھڑکنے لگا ـــــ دروازے پر دستک دینے سے پہلے وہ کھڑی ہوگئی اور اپنی الجھی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی، پھر اس نے آخری بار کوٹ کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے چھوا۔ ہونٹوں تک لائی اور بے اختیارانہ چوم لیا۔

دروازے پر دستک کی آواز دیوانے کی چیخ کی طرح لمحہ بھر کے لئے گونج کر مر گئی۔

کچھ دیر توقف کے بعد اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن مانوس قدموں کی چاپ اس کے کانوں میں نہ سنائی دی۔ "عجیب بے ڈھنگی لڑکی ہے ذراسی دیر کیا ہوگئی، کہ کھاٹ کرسوتی بنی!" اس نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"میں بھی نری احمق ہوں۔ اتّی رات گئے جوان جہان لڑکی بھائیں بھائیں کرتے اندھیرے میں اکیلی تھوڑی بیٹھی ہو گی۔" اس نے سوچا اور بوا حمیدہ کی جھگی کی طرف چل دی۔ بوا حمیدہ کا اور اس کا گھر تنگ سی گلی کے دائیں بائیں ہی تھے۔ وہ گلی میں رینگ گئی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔

بوا حمیدہ کے گھر پہ ابھی وہ دستک ہی دینے والی تھی کہ اس کی نظر ہیں اپنی کھڑکی پر جا پڑی۔ جھری میں سے روشنی کی بہت باریک سی کرن اندھیرے کے سینے میں اتر رہی تھی غیرارادی طور پر وہ کھڑکی تک آئی اور پنجوں کے بل اندر جھانکنے لگی۔ کوٹ اس کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

ماسی کا سر چکرانے لگا۔ پتنگے اور دھبے اس کی نگاہوں کے آگے تیزی سے رقص کرنے لگے۔ عجیب سی دھند چھا گئی۔ جھاڑیوں کے پیچھے اکرم رشیدہ پر جھکا ہوا تھا۔

ماسی کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ نیچے آرہی کوٹ کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ لیکن چند نوٹ اس کی مٹھی میں بچے ہوئے تھے۔ اس کے ماؤف ذہن میں بس ایک ہی خیال تیزی سے چکرا رہا تھا۔

"اپنی رحیمہ سے کیا طلب کرے وہ؟"

رضیہ فصیح احمد

پائلٹ

"باجی، باجی ـــــ باجی دیکھئے۔"

اُس نے ماں کو نظر انداز کر کے اُوپر سے آنے والی زیادہ پُرشور آواز کی طرف دیکھا۔ ہرے رنگ کی دُم اور سفید جسم والا ہوائی جہاز بہت نیچے، بہت ہی نیچے گویا ان کے سروں پر سے اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کی رفتار سُست تھی مگر نیچے ہونے کی وجہ سے گھن گرج بہت تھی، وہ بہت وقار سے آہستہ آہستہ گزرا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سیدھا سامنے والے پہاڑ سے جا کر ٹکرا جائے گا اور جب ذرا نزدیک پہنچا تو بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پہاڑی پر بنے ہوئے سفید اور سبز رنگوں والے مکان کے دروازے میں گھستا چلا جائے گا لیکن جب وہ گزرا تو وہ منہ پھاڑے دیکھتی رہ گئی کہ وہ پہاڑ کے بلند ترین، درختوں کی بلند ترین چوٹیوں سے بھی اوپر گزر گیا تھا۔

اُس کے غائب ہو جانے کے بعد وہ دفعتاً "چھاتی" پر ہاتھ دھر کر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ "واحد۔ ضرور واحد ہوگا!"

نعیم نے لکھا تو تھا کہ واحد پائلٹ ہوگیا ہے اس کا روٹ ـــــ سے ـــــ تک ہے۔ تمھاری ہی طرف سے تو اس کا جہاز جاتا ہوگا ـــــ ہاں اسے معلوم تھا کہ اس روٹ کا جہاز اسی طرف سے جاتا ہے۔ اس نے اکثر بیٹھے ہوئے یہ جہاز گزرتے دیکھے تھے مگر وہ سب یہاں سے بہت دُور وادی کے بیچوں بیچ پہاڑی کے پس منظر میں سفید کپڑے کی طرح

چلتے نظر آتے تھے اور یہ عین اسکے سر پر سے گزرا تھا۔ واحد کو زیادہ سے زیادہ ان کا علاقہ ہی معلوم ہوگا مگر یہ کیا اتفاق تھا کہ وہ بالکل اس کے گھر کے اوپر سے گزرا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اس وقت دوربین لگائے دیکھ رہا ہو اور اس نے مجھے اوپر دیکھتے دیکھ لیا ہو۔

وہ سارا دن ہشاش بشاش رہی۔ بار بار کوئی خوشی کا نغمہ اَن جانے میں اس کے ہونٹوں پر تیر جاتا۔ رات کو لیٹنے سے پہلے چپکے سے اس نے اپنے کمرے میں لگے ہوئے آج کے دن پر سُرخ نشان کھینچا اور بستر پر لیٹ کر جہاز کی مُدھر خیالی آواز سنتی رہی۔

کیلنڈر پر لگائے ہوئے سرخ نشان والے دن کے انتظار میں وہ ابھی پوری طرح گھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک دن اچانک پھر وہی جہاز بالکل اسی طرح اوپر سے گزرا۔ وہ اندر تھی۔ آواز سنتے ہی وہ لپک کر باہر آئی اور غیر شعوری طور پر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگی۔ مانو اور رانی پہلے سے یہی کر رہے تھے، اس لئے انھوں نے اس کی حرکت کو محسوس نہیں کیا۔ جب جہاز وہ پہاڑی بالکل اسی خواب ناک انداز میں پار کر گیا تو وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ سی ہوئی۔ مگر دل میں مسرت کی ہلکی سی لہر بھی تھی، کیا معلوم واحد نے دیکھ ہی لیا ہو۔

باقی دن بھر ہوائی جہاز کی مدھر گھر گھر اس کے حواسوں پر باجہ بجاتی رہی۔ ہائے اللہ بالکل ہمارے گھر پر سے ...... کیا کسی دن ایسا بھی ہوگا کہ واحد کوئی لفافہ جس کے اندر اس کی تصویر ہو یا گلاب کے پھولوں کا گلدستہ یا کوئی رومال اوپر سے پھینک دے جس پر ڈبلیو کڑھا ہوا ہو۔ ہائے اللہ اگر ایسا ہو تو کتنا مزا آئے اور جب وہ اپنے اس خیال کی خوبصورتی سے دل بھر کے خوش ہو چکی تو اس کے مضحکہ خیز پہلو سامنے آنے لگے۔ اتنی بلندی سے لفافہ اور رومال نہ جانے کہاں جا پہنچے گا اور پھولوں کی ہڈیاں پسلیاں تک چور چور ہو جائیں گی اور پھر وہ یہ کیسے کر سکتا ہے جب کہ ان کے اور ہمارے گھر کی خاندانی لڑائی ہے ـــــــ نجمہ بھی تو مہینے دو مہینے میں کسی اور سہیلی کے پتے پر میرے نام ایک دو خط بھجوا دیتی ہے۔ ہائے اللہ تو کیا میں صرف اس جہاز کو تکتی رہونگی خود اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ نہیں وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ کیا یہ اس کی محبت کی نشانی نہیں تھی کہ جس گھر کا صحن اس کے قدموں پر حرام تھا، اس کی گھر کی فضا کو اس نے اپنے اوپر حلال کر لیا تھا۔

اے اللہ، تو ان بڑوں کو سمجھ دے اور پھر وہ یہ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ وہ امّی اور ابا کو کس طرح بتائے کہ یہ واحد ہے، جو ہر ہفتے اپنی موجودگی کا احساس دلانے، اپنی حیثیت منوانے خوشامد کے طور پر اس گھر کا طواف کرنے آتا ہے تاکہ جب وقت آئے تو اس کے ابا امی اس کی ان وفاؤں کو یاد رکھیں اور انکار نہ کر دیں ـــ واحد کا یہ اصرار یہ طواف کتنا بلند تھا، اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کو نوکروں کے ذریعے گھر سے نہیں نکلوایا جاسکتا تھا۔ اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ گھر والے گھر پر نہیں ہیں۔ وہ آ۔ آتا تھا اور " مجھے یاد رکھنا" ـــ " مجھے یاد رکھنا" کہتا ہوا سر سے گزر جاتا تھا اور وہ اسے یاد رکھتی تھی۔ اس سہانی آواز کے انتظار میں جیتی تھی، جس کا کوئی دن کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ مگر جو ہفتے میں ایک بار ضرور سنائی دیتی تھی۔ وہ پورا جہاز اور اس جہاز کا ایک ایک حصہ تصویر کی طرح اس کی نظروں میں سما گیا تھا۔ یہاں تک کہ جہاز کے تلے میں بنی ہوئی تین رنگین لائٹیں بھی اکثر تنہائی میں اس کی آنکھوں کے سامنے تیرا کرتیں۔

اور آخر ایک دن یہ راز اس کی برداشت سے باہر ہو گیا اور چھاتی پھاڑ کر باہر نکل آیا۔ جب وہ جہاز بردباری اور بلند آہنگی سے سر پر سے گزر گیا تو اس نے جھک کر مانو کے کان میں کہا ـــ

" جانتے ہو اس جہاز میں کون ہے ؟ "

" ہاں آدمی ـــ !" مانو نے پاگل پن سے کہا۔

" آدمی نہیں واحد ـــ واحد بھائی تمھارے جو لاہور میں رہتے تھے ہمارے گھر کے پاس۔ شام کو سفید پتلون، سفید قمیص پہن کر ٹینس کھیلنے جایا کرتے تھے، بڑے بڑے کالے کالے بال تھے جن کے گردن تک اور بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں تھیں جن کی....

" ہاں جو ہمیں ٹافی دیتے تھے کبھی کبھی ـــ " مانو کو یاد آیا۔

" وہی وہی ـــ وہ وہی اس جہاز میں ـــ "

" اچھا ـــ وہ کیا کر رہے ہیں اس جہاز میں۔"

" اسے چلا رہے ہیں۔"

"ہیں باجی وہ اسے چلا رہے ہیں!"

"ہاں"

اس دن مانو کو اپنے راز میں شریک کر کے وہ بے حد خوش تھی۔ اس کا دل چاہا وہ یہ بھی اگل دے:۔

"مانو وہ تیری باجی کی خاطر ادھر سے گزرتے ہیں۔ ہائے اللہ اتنے نیچے۔ بڑے ہمت والے ہیں وہ۔ میں نعیمہ کو لکھوں گی واحد سے کہنا اتنے نیچے سے نہ جایا کریں، مجھے ڈر لگتا ہے۔"

پھر وہ خیالات کے ریلے میں بہنے لگی۔ اگر جہاز اوپر سے گزرا تو اسے آواز کس طرح آئیگی۔ اسے کیسے پتہ چلے گا کہ واحد آیا تھا۔ اگر واحد نے اسے باہر کھڑا نہ پایا تو اسے افسوس ہوگا۔ مگر کچھ بھی وہ ضرور لکھے گی کہ واحد سے کہنا، اتنے نیچے تو نہ چلایا کریں۔ نعیمہ یہ جملہ واحد کو سنائیگی۔ وہ مسکرائے گا۔ آنکھوں کی جوت بڑھ جائے گی۔ پھر وہ بال پیچھے پھینک کر سیٹی سی بجائے گا اور اگلی دفعہ..... اگلی دفعہ شاید اس سے بھی نیچے گزرے گا۔ اس سے بھی نیچے۔ ہائے اللہ.....

کئی دن سے موسم شام کو یکایک خراب ہو جاتا تھا۔ مغرب کی طرف سے ایکا ایکی گہرے گہرے بادل چھاتے اور گھٹا ٹوپ ہو جاتے۔ پھر ان میں سے نیلے نیلے رنگ کی خوفناک سی بجلی چمکتی جو شیشوں والے کمرے سے ہوتی ہوئی اندر تک در آتی اور اس کے بعد اتنے زور کی کڑک کہ دل لرز کر رہ جاتا۔ کچھ دیر یہ تماشا ہوتا اور پھر یکایک بوندیں پڑے بغیر ہی اولے گرنے شروع ہو جاتے۔ اولوں کے ساتھ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کی خوفناکی کئی گنا بڑھ جاتی۔

آج اس قسم کے موسم کو یہ چوتھا دن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اچھی خاصی دھوپ تھی۔ مانو اور رانی امی سے پوچھ کر سیر کے لئے چلے گئے تھے۔ یکایک موسم خراب ہوا تو امی اور ان کی تسلی کے لئے ابا بھی برآمدے میں آ کھڑے ہوئے۔ بجلی کے ڈر کے باوجود وہ ذرا آگے آ کر پگڈنڈی پر مانو اور رانی کو دیکھنے گلاب کی باڑھ پر جھک گئی۔ دفعتاً وہی جانی پہچانی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ سبز دم اور سفید جسم والا ہوائی جہاز اسی متانت اور وقار سے چلا آ رہا تھا۔ مشرق کی طرف سے پہلے سے

بھی نیچے، جیسے مغرب کی طرف سے اُٹھتے ہوئے دھواں دھار بادلوں کو چیلنج کر رہا ہو۔

"جانے کون پگلا ہے، اس موسم میں اتنے نیچے جا رہا ہے۔" امی، مانو اور رانی کو بھول کر اوپر دیکھنے لگیں۔ وہ تو پہلے سے ہی اوپر دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا جیسے وہ اس موسم میں اتنے نیچے آجانے پر احتجاج کر رہی ہو۔ ابا بھی ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح گھر میں گھستے گھستے جیسے وہ ارادہ بدل کر اوپر سے گزر گیا اور پہاڑ کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک زور کا کڑاکا ہوا۔

"اللہ رحم!" امی نے دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لئے۔ "کتنے زور کی کڑک ہے۔"

"یہ کڑک نہیں دھماکا بھی ہے جہاز کا کریش ہو گیا، وہ دھواں دیکھ رہی ہو——؟"

اسی لمحے، بالکل اسی لمحے موٹے موٹے اولے برسنے لگے۔ نہیں معلوم اس نے ابا اور امی کے اس مکالمے کا کتنا حصہ سُنا، ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے تیز برچھی کی انی اس کے سینے میں اُتار دی۔ وہ جھونک کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

پورے طور پر ہوش میں آنے سے پہلے اس کے کانوں میں کسی کی باتوں کی آواز آئی۔ "دل کی بہت کمزور ہے، ادھر بجلی کڑکی ادھر جہاز کا دھماکا ہوا، بس یہ غش کھا کر گر پڑی۔ بارہ گھنٹے سے بے ہوش ہے۔" اور اس وقت پورے ہوش میں آکر جیسے کسی نے برچھی کی انی دوبارہ اس کے دل میں گزار دی، تو جہاز کا کریش محض واہمہ نہیں تھا——!!

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ باتیں کرنے والے شاید برآمدے میں تھے۔ کمرہ خالی تھا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ مانو اخبار ہاتھ میں لئے سامنے سے گزرتا گزرتا اس کو ہوش میں دیکھ کر اندر آگیا۔

"باجی، باجی دیکھئے کل کے کریش کی تصویر اس میں آئی ہے۔ پائلٹ کی تصویر بھی ہے۔ اور اس کے بیوی بچوں کی بھی ——"

"بیوی بچوں ——" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

کل کے کریش کی تصویر تھی، جہاز پہاڑیوں میں گرا ہوا زمین پر ڈھیر کی شکل میں پڑا تھا۔ پائلٹ کی تصویر تھی، ایک چھ فٹے قد آور جوان کی تصویر، جس کے چھوٹے چھوٹے بال تھے اور جو اپنی بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ حادثے کی خبر میں لکھا تھا۔ پائلٹ کی بیوی کا گھر حادثے کی جگہ سے صرف چند فرلانگ دور تھا۔

اس نے ایک گہری لمبی سانس لی تو وہ واحد نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا اسی وقت اٹھکر وضو کرے اور سجدۂ شکر بجالائے کہ وہ واحد نہیں تھا مگر اسوقت اس کے دل میں برچھی کی انی تیسری مرتبہ چبھی۔ اس مرتبہ بھی اس کی تکلیف پہلے سے کچھ کم نہ تھی گو انداز جدا تھا۔

تو وہ واحد نہیں تھا جو ہر ہفتے ان کے گھر کے اوپر سے گزرا کرتا تھا۔ وہ کوئی اور تھا جو کسی اور کی خاطر۔۔۔۔۔۔۔

رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمہ ڈاک سے بھی کیجئے

قتیل شفائی

ایک معصوم سوال

سہیلی مجھ کو بتلا دے مرا دل کیوں دھڑکتا ہے ـــــــ سہیلی مجھ کو بتلا دے
جو سینے میں خلش ہے تو اسے پہچانتی ہوگی
محبت کیا اسی کا نام ہے تو جانتی ہوگی
خیالوں میں کوئی گھونگھٹ اٹھا کر مجھ کو تکتا ہے ـــــــ مرا دل کیوں دھڑکتا ہے
سہیلی مجھ کو بتلا دے

نہ جانے میری سانسوں میں یہ اک لہکار سی کیا ہے
بنا پائل جو سنتی ہوں وہ اک جھنکار سی کیا ہے
بتا دے کون سے موسم میں یہ شعلہ بھڑکتا ہے ـــــــ مرا دل کیوں دھڑکتا ہے
سہیلی مجھ کو بتلا دے

مرا دل جھومتا ہے گیت اپنے آپ سن سن کر
جوانی مسکراتی ہے کسی کی چاپ سن سن کر
میں اکثر چونک پڑتی ہوں جو پتہ بھی کھڑکتا ہے ـــــــ مرا دل کیوں دھڑکتا ہے
سہیلی مجھکو بتلا دے

انوکھی سی کوئی تصویر دل کو گدگداتی ہے
نہیں ہے سامنے کوئی مگر آواز آتی ہے
کوئی جھونکا نہیں پھر بھی مرا آنچل سرکتا ہے ـــــــ مرا دل کیوں دھڑکتا ہے
سہیلی مجھ کو بتلا دے

سردار جعفری

جب صبا آئے گی

جب صبا آئے گی ہر زلف کو مہکاتی ہوئی
رنگ کے جام در و بام سے چھلکاتی ہوئی
برگ صد لالۂ و گل راہ میں بکھراتی ہوئی
شب کی مے صبح کے پیمانے میں ڈھل جائیگی
ختم ہو جائیں گے سب سردیٔ دل، تلخیٔ جاں
شمعِ افسردگیٔ رُوح پگھل جائے گی

باغ خوابیدہ سہی خنکیٔ شبنم پہ نہ جاؤ
یہ تو ہیں رات کے آنسو جو ڈھلک جائیں گے
ایک اک شاخ میں ہے دوڑی ہوئی آتشِ گل
جب صبا آئیگی شعلے بھی چمک جائیں گے
لب مہک اٹھیں گے، رخسار دہک جائیں گے

صلاح الدین محمد

بے وفا

کون آوارہ ہے!
تیرگی بولے گی
مہتاب گواہی دے گا
کوئی خلوت ہے نہ جلوت ہے یہاں
جسمِ بے خواب گواہی دے گا
پاس آجاؤ!
ترستے ہوئے ہونٹوں نے کہا
پاس آجاؤ کہ انگ انگ بلاتا ہے تمھیں
پاس آجاؤ!!
لرزتی ہوئی آواز چلی
کون آوارہ ہے
دل کے ہر گوشۂ بیدار میں تم ہی تم ہو
حسرتیں ہوں گی کہیں گوشۂ خاموشی میں

حبیب تنویر

خلیج

کیا یہ چاند
وہ نہیں ہے کہ جو تھا
کیا گلستاں کی بہار
ہوگئی دیکھتے ہی دیکھتے اتنی تبدیل
اور مرا ذوق ہی بیگانۂ تغیر رہا

چاند شاید ہے وہی
یہ گلستاں یہ بہار
یہ شگوفے یہ وہی ہیں کہ جو تھے
کچھ جو بدلا ہے تو بدلا ہے مرا دل مری آنکھیں
اجنبی میرا ہی اک ذوق ہے —
ورنہ ماحول وہی ہے کہ جو تھا
آج سے ساٹھ صدی قبل

حیرتی ایک میں تنہا ہوں گلستانوں میں
ورنہ گلشن بھی وہی شاخِ نشیمن بھی وہی
فطرتِ دہر وہی
اجنبی میری ہی اک فطرت ہے —
جو بدلتی ہی بدلتی ہی رہی
اپنے ماحول سے ہوتی رہی دُور
یعنی ماحول وہی ہے کہ جو تھا
آج سے ساٹھ صدی قبل

محمود شام

للکار

دھرتی دہک رہی تھی، جوانی پہ دھوپ تھی
سورج کا عزم تھا کہ ہر اک شے کو پھونک دوں
حدِّ نگاہ تک تھا دہکتا ہوا غبار
پاؤں جلا رہی تھی اجل رنگ — گرم ریت
تا دورِ زیست کا کوئی نام و نشاں نہ تھا
اک میں پناہ گیر تھا —— اور ایک پیڑ تھا
ننھا سا ایک پیڑ — جو نازک بدن کے ساتھ
سینے پہ سہہ رہا تھا شعاعوں کی بارشیں
للکارتا تھا گھورتے سورج کی آنکھ کو !
ہمت اگر ہے میرے پناہگیر کو تو دیکھ !

مظہر امام

بیوہ

چاند نکلا ہے آنسو بہاتا ہوا
اپنے سینے کے زخموں کو عریاں کئے
کاسۂ چشم میں کچھ سوالات ہیں
"نور چھنتا ہے یا بہہ رہا ہے لہو؟
جھانک کر میرے دل میں تو دیکھے ذرا
مجھکو تھوڑی تسلی تو دیدے کوئی"

زندگی، زندگی کا جنازہ لئے
کوچۂ آرزو میں بھٹکتی ہوئی
سنگِ ادبار پر سر پٹکتی ہوئی
ایک بے نام منزل کی جانب رواں
ایسی منزل کہ جس کا نہیں کچھ نشاں

جل بجبیں چشم و عارض کی شادابیاں
عشق اور عقل پر گردِ غم جم گئی
منجمد ہوگئے رنگ و بو کے کنول
میرے جذبات کی بیوگی دیکھ لو
ہانپتی کانپتی شاعری دیکھ لو

ڈاکٹر عزیز تمنائی

رازِ حیات

قریب آؤ کہ اک لمحۂ جمیل کی یاد
ہزاروں صدیوں کی رعنائیاں سمیٹے ہوئے
تمام عمر مری سانس میں جھلکتی رہے
قریب آؤ کہ پھر سے کنارِ رُکنا باد
فنا کی ریت پہ نقشِ دوام بن جائیں
کہ پھر سے گوشۂ خلوت گہِ تمنّا سے
رباب و چنگ کی آواز جانفزا اُٹھے
چلو کہ نور صفت تیرگی سے چھن جائیں

یہ ایک لمحے کی قربت یہ ایک پل کا وصال
اسی سے قلب و نظر مطلعِ فراغت ہے
اسی سے انفس و آفاق میں حرارت ہے
اسی سے روحِ زمان و مکاں میں عکسِ جمال
پھر ایک بار یونہی لب پہ لب ہوں ہاتھ میں ہاتھ
قریب آؤ کہ پیوستگی ہے رازِ حیات

مخمور سعیدی

کرسمس کی رات کو

کتنے سورج افق میں ڈوب گئے ——
آسماں پر پگھل گئے کتنے چاند
روشنی کس قدر ستاروں کی
ظلمتوں سے الجھ کے پڑ گئی ماند
—— کبھی اک منظرِ ثبات دِسکوں
دورِ ایام سے بہم نہ ہوا
سال و سن کا شمار بڑھتا گیا
خلفشارِ حیات کم نہ ہوا
لمحہ لمحہ گزر رہا ہے وقت ——
مہلتِ زیست گھٹتی جاتی ہے
ہر نفس پر یہ جاں گداز احساس
عمر بے سود کٹتی جاتی ہے
—— موت نے جیسے کھا رکھی ہو قسم
وقت بے وقت یاد آنے کی
ہر بہانے سے لوگ کرتے ہیں
کوششیں خود کو بھول جانے کی
آج کی رات بھی بہانہ ہے ——
خود فراموشیوں کی کوشش کا
بجز اس کے کوئی جواز نہیں
اس جنوں خیز شور و شورش کا
—— مستیاں، رقص، قہقہے، نعرے
اتنا ہنگامہ ہم جو کرتے ہیں
آنے والی سحر کی آہٹ سے
غالباً دل ہی دل میں ڈرتے ہیں

عقیق تابش

گریہ

زندگی کب ہوئی سیرابِ حیات
اک نہ اک تازہ سفر جاری ہے
سلسلۂ ریگِ ناپیدا کنار
تا نظر —— کتنے سراب اندر سراب
نگہ و دل کے قریب
نو دمیدہ سی اُمیدیں جو فقط صرصرِ خواب
اپنی تعبیر سے پہلے ہی تماشہ ٹھہریں
آنکھ کہ کاسۂ خالی زِ نشاط ——
کو بہ کو ٹھوکریں کھاتی ہی رہی

بیش از جنبشِ یک تا بہ نفس بھی مجھ کو
اتنی فرصت نہ ملی
کوئی تصویر کشیدہ کرتا
حرفِ آخر کی طرح
—— اے دلِ آشفتہ مزاج!

بیکل اتساہی

گیت (اندیشے)

ایک مایوس کو تونے آواز دی ——— اے یقیں دیکھ پھر کوئی دھوکا نہ ہو

تیری آواز کی چھاؤں میں ہے سکوں
بیٹھ جائے نہ تھک کر شعورِ جنوں
تیرے آنچل کی پروائی میں اڑ چلوں
ایک ناداں کی پرواز کا یہ فسوں

جیسے چنچل تخیل کی سنجیدگی ——— اے یقیں دیکھ پھر کوئی دھوکا نہ ہو

کچھ سکوں بخش یادوں کی انگڑائیاں
دھوپ میں جیسے بادل کی پرچھائیاں
سہمے سہمے ارادوں کی تنہائیاں
جیسے مرگھٹ میں بجتی ہوں شہنائیاں

ہے مقدس اداسی میں کچھ دلکشی ——— اے یقیں دیکھ پھر کوئی دھوکا نہ ہو

چاندنی کے ہنڈولے میں جھولے گگن
جیسے ڈولے میں میکے کو سوچے دُلہن
گنگا جل پر تھرکتی ہوئی ہر کرن
جیسے صحرا میں فکرِ غریب الوطن

جیسے سہمے ہوئے آنسوؤں میں ہنسی ——— اے یقیں دیکھ پھر کوئی دھوکا نہ ہو

ایک مایوس کو تونے آواز دی
اے یقیں دیکھ پھر کوئی دھوکا نہ ہو

ریاض الرحمن شروانی

قاضی عبدالغفار بحیثیت سوانح نگار

قاضی محمد عبدالغفار مرحوم اُردو ادب کی ان جاندار اور رنگا رنگ شخصیتوں میں سے تھے جن کے کارنامے گوناگوں ہوتے ہیں اور جو اپنے قلم کی جنبش سے ایسے لالہ و گل کھلاتے ہیں جن کی تر و تازگی سدا بہار ہوتی ہے اور جن کے رنگ و بو سے نہ صرف انکے ہمعصر بلکہ بعد میں آنے والی نسلیں بھی فرحت و انبساط کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ حاصل کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے قلم کی جولانیوں سے ہمارے رنگ و بو کا اَمٹ ذخیرہ ہی نہیں مہیا کیا بلکہ جینے کا سلیقہ بھی سکھایا اور حوصلہ بھی عطا کیا۔ قاضی صاحب کا خاص میدان طنز و شوخی ہے۔ ان کے طنز کی خصوصیت یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی سے وہ اسے گوارا بنا دیتے ہیں۔ ان کا طنز بد مزہ نہیں کرتا ہے بلکہ اس میں تلخی اور شیرینی کا بڑا دل آویز امتزاج ہوتا ہے اور یہ اُن کی پُر خلوص شخصیت کا اثر ہے۔

میں نے قاضی عبدالغفار کو اُردو ادب کی جان دار اور رنگا رنگ شخصیت کہا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے "ادبی فتوحات" کسی ایک دائرے میں محدود نہیں ہیں بلکہ انھوں نے مختلف اصنافِ ادب پر اپنی ذہنی صلاحیتوں کے نقش ثبت کئے ہیں۔ اور جو کچھ لکھا ہے اسمیں بیک وقت رنگینی توانائی اور دل سوزی کا احساس ہوتا ہے۔ دیگر اصنافِ ادب کے علاوہ فن سوانح نگاری بھی ان کے قلم کی فیض رسانیوں سے بہرہ یاب ہوا ہے اور اس مضمون کا منشا انکی سوانح نگاری ہی کا جائزہ لینا ہے۔

اُردو میں سوانحی ادب کا ذخیرہ بڑی حد تک تشنہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تذکرہ نگاری کی جن روایات پر ہمارے ادیبوں نے اس فن کی بنیاد رکھی ان سے وہ اپنا دامن بہت کم بچا سکے ہیں۔

ہمارے ذہنوں میں وضع داری، مُردہ پرستی اور بزرگوں کے احترام کے تصوّرات کچھ اس طرح جاگزیں ہیں کہ ہم تصویر کا صرف ایک ہی رُخ دیکھنے اور دکھانے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ اس طرح کے تصوّرات تذکرہ نگاری میں تو کام آسکتے ہیں لیکن ان سے سوانح نگاری کا حق ادا ہونا ممکن نہیں ہے۔ جن لوگوں نے ان اصولوں سے انحراف کیا ان میں سے بھی اکثر کا مقصد سوانح نگاری کا حق ادا کرنا نہیں تھا بلکہ صاحب سوانح سے خود اپنے یا اپنے کسی بزرگ کے ذہنی تعصب کا بدلہ لینا تھا۔ اس طرح سوانح نگاری کی یہ دوسری قسم پہلے سے بھی بدتر اور ایک رخی ہو گئی۔ پہلی صورت میں سوانح نگار کو کم سے کم اس کی شرافت، خلوص اور نیک نیتی کا اجر تو مل جاتا، دوسری صورت میں وہ اس سے بھی محروم ہو گیا۔

قاضی عبدالغفار نے تین سوانح عمریاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، آثار جمال الدین افغانی، آثار ابوالکلام آزاد اور حیات اجمل۔ غالب کو شعروں کے انتخاب نے "رسوا" کیا تھا، قاضی صاحب کی شخصیت اور ذوق و وجدان پر ان کے ہیروؤں کے انتخاب سے روشنی پڑتی ہے۔ جمال الدین افغانی اور ابوالکلام آزاد میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ مشرق کی پستی اور اس پستی میں مغربی سامراج کی کارفرمائیوں اور ریشہ دوانیوں کا احساس، غلامی سے بیزاری اور آزادی کی تڑپ، اسلام کی جدید حالات کے مطابق تعبیر و تشریح کی ضرورت کا عرفان اور مذہب و سیاست کے رشتے کی کھوج۔ جمال الدین افغانی پین اسلام ازم کی تحریک کے قائدِ اعظم تھے اور ابوالکلام آزاد نے بھی اپنے سیاسی سفر کا آغاز تحریکِ خلافت سے کیا تھا جو دراصل پین اسلام ازم ہی کی بدلی ہوئی صورت تھی۔ انھوں نے جب ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے "الہلال" جاری کیا تو انکے سامنے "العروۃ الوثقیٰ" کی مثال تھی۔ ان کا طرزِ تحریر بھی "العروۃ الوثقیٰ" افغانی کے طرزِ تحریر سے متاثر تھا اور اس میں وہی خطابت، جوش اور سرخوشی تھی جو "عروۃ الوثقیٰ" افغانی کی تحریروں کی خصوصیت تھی۔ البتہ کچھ عرصے کے بعد مولانا آزاد ان منزلوں سے آگے نکل گئے اور انھوں نے اپنی ذہانت، مطالعے اور فطرتِ سلیم کے طفیل میں نئی منزلوں کا سراغ پالیا۔ جو زیادہ بلند، زیادہ حقیقی اور عصرِ جدید کے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ تھیں اور اسی اعتبار سے ان کے طرزِ تحریر میں بھی زیادہ

خوشگوار تبدیلیاں ہوگئیں۔ خود قاضی عبدالغفار کی شخصیت اور کردار میں ہمیں ان میں سے کئی خصوصیات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ غلامی سے بیزاری اور آزادی کی تڑپ ان میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھی اور عملی زندگی کے ابتدائی دور میں وہ بھی تحریکِ خلافت سے متعلق رہے تھے۔

اسی طرح مولانا آزاد اور حکیم محمد اجمل خاں کا نقطۂ اتصال حصول آزادی کی خواہش کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ تھا۔ اسلامی روایات اور انڈو پرشین تمدن کے دونوں امین اور علم بردار تھے۔ دونوں میں شرافت نفس، ضبط و تحمل اور خودداری و کم آمیزی کی صفات پائی جاتی تھیں۔ اور دونوں باوجود خالص مشرقی اور اسلامی تعلیم و تربیت کے دورِ حاضر کے تقاضوں سے واقف اور ان کے حامی و نقیب تھے۔ اگرچہ اس آخری خصوصیت میں مولانا آزاد کا پایہ حکیم صاحب سے بلند تھا۔ قاضی صاحب بھی ہماری قدیم تہذیب و شرافت کا دل آویز نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل پر نظر رکھتے تھے اور فرقہ پرستی کی مخالفت اور ہندو مسلم اتحاد کے معاملے میں مولانا آزاد اور حکیم اجمل خاں کے نقشِ قدم پر چلتے تھے۔

قاضی صاحب کو مولانا آزاد اور حکیم اجمل خاں سے ذاتی طور پر نیاز حاصل تھا اور وہ دونوں سے قریب رہے تھے، حکیم صاحب سے زیادہ اور مولانا سے کم۔ افغانی کا انھوں نے صرف ذکر سنا تھا اور ان کی شخصیت اور کارناموں سے ان کی واقفیت کا ذریعہ کتابی تھا۔ "آثار ابوالکلام آزاد" کے مقدمے میں خود انھوں نے لکھا ہے "افغانی کو دیکھا نہ تھا مگر ڈھونڈا تھا اور تھوڑا بہت پایا بھی تھا"۔ اس لیے حیات اجمل میں شخصی رنگ سب سے زیادہ ہے، آثار ابوالکلام آزاد میں اس سے کم اور آثار جمال الدین افغانی میں بالکل نہیں ہے۔ البتہ افغانی کی زندگی اور کارناموں سے متعلق انھوں نے مواد بڑی تلاش و جستجو سے جمع کیا۔ ہندوستان میں بھی اور ہندوستان سے باہر یورپ اور مصر وغیرہ میں بھی۔ یہ ان کی پہلی سوانح تصنیف ہے اس لیے اس میں وہ فنی پختگی اور بصیرت تو نہیں ملتی جو آثار ابوالکلام آزاد میں ملتی ہے لیکن محنت اور کاوش سب سے زیادہ اسی میں کی گئی ہے۔

آثار جمال الدین افغانی اور حیاتِ اجمل دونوں کم و بیش سیاسی سوانح عمریاں ہیں یعنی ان میں زیادہ

زور قاضی صاحب نے صاحب سوانح کی سیاسی شخصیت پر دیا ہے اور "تاریخی واقعات کے جو کھٹے ہیں" ان کی تصویر اس طرح لگائی ہے کہ جو کوئی ان کی زندگی کے حالات پڑھے وہ اس زمانے کے سیاسی ماحول سے بھی واقف ہوتا جائے (مقدمہ حیات اجمل)۔ ایسا کرنا ضروری تھا کیونکہ اس کے بغیر افغانی یا حکیم صاحب کی شخصیت اور کارناموں کا ادراک ممکن نہیں تھا۔ لیکن ان کی دوسری حیثیتوں پر اتنی توجہ نہیں کی جا سکی ہے جتنی کرنی چاہئے تھی۔ مثلاً افغانی علاوہ پین اسلام ازم کی تحریک کے رہنما کے ادیب اور صحافی بھی تھے اور ان کے قلم میں بڑا زور اور جان تھی اور حکیم اجمل خاں علاوہ صفِ اوّل کے سیاسی لیڈر اور ہندوستان کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے داعی اور مبلغ کے بلند پایہ طبیب اور اس لحاظ سے شریف خانی اطبّہ کی روایات کے نہ صرف وارث اور امین بلکہ انھیں ترقی دینے اور آگے بڑھانے والے بھی تھے۔ اگرچہ ان دونوں کی ان حیثیتوں پر بھی قاضی صاحب نے لکھا ہے لیکن ان کا پورا حق نہیں ادا کر سکے ہیں۔

جمال الدین افغانی نے اپنی جد وجہد کی بنیاد اسلامی ممالک کی بیداری پر رکھی تھی۔ اسلامی ممالک دوسرے ایشیائی اور افریقی ممالک کی طرح اس وقت یوروپین استعمار کی گرفت میں تھے اور ان کی تعداد ان دونوں براعظموں میں قابل لحاظ تھی۔ ان کی بیداری کا اثر دوسرے ایشیائی اور افریقی ممالک کی بیداری پر پڑنا لازمی تھا اس طرح افغانی کی جد وجہد بالواسطہ پورے ایشیا اور افریقہ کو متاثر کرتی تھی اور اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا تھا۔ قاضی صاحب نے افغانی کی جد وجہد کو اسی پس منظر میں دیکھا ہے اور دوسرے لوگوں کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ خود ہمارے ملک میں یہی جذبہ کارفرما تھا جب مہاتما گاندھی نے تحریک خلافت سے ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کی قیادت قبول کی تو وہ سمجھتے تھے کہ اس کا اثر ہندوستان کی تحریک آزادی پر خوش گوار ہوگا۔ دوسری طرف مسلمانوں میں ایسے حضرات تھے جن کا خیال تھا کہ ہندوستان کی آزادی سے بدیشی سامراج کی جڑیں کمزور ہو جائیں گی اور اسکے نتیجے میں اسلامی ممالک کی تحریک آزادی کو تقویت حاصل ہوگی۔ عملاً ایسا ہوا بھی لیکن ساتھ ہی میرے خیال سے اس سے یہ نقصان بھی ہوا کہ عام لوگوں کے ذہنوں میں مسائل الجھ گئے اور انکے

لئے مذہب اور سیاست کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا دشوار ہوگیا۔ پھر جب بدیشی سامراج نے مذہب کا سہارا لے کر عوام میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی تو اس کا کام آسان ہوگیا اور لوگ فرقہ پرستی کے شکار ہوگئے۔

اسی طرح ایک بحث یہ ہے کہ افغانی کی تحریک میں وطنیت اور قوم پرستی کا کیا مقام تھا۔ قاضی صاحب کی رائے ہے کہ "انھوں نے اپنی تحریک میں وطنیت اور قوم پرستی کے عناصر کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا...... شیخ اپنی تحریک اتحاد اسلامی میں مسلمان اقوام کی وطنی اور قومی وحدتوں کو محو کردینا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہر وحدت کو بجائے خود وطنیت کے جذبے پر مستحکم کرکے ان کا ایک ایسا وفاق بنانا چاہتے تھے جو یوروپین امپیریلزم کی درازدستی کا مقابلہ کرسکے۔" پھر انھوں نے مصر، ایران اور ترکی میں افغانی کی تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے اس میں وطنیت اور قوم پرستی کے عناصر کو اُجاگر کیا ہے اور اسے فرقہ پرستی سے بالاتر بتایا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ پین اسلام اِزم اور نیشنلزم میں جو بنیادی تضاد ہے اسے قاضی صاحب پوری طرح رفع نہیں کرسکے ہیں اور مسئلہ کچھ زیادہ واضح نہیں ہوا ہے۔

جمال الدین افغانی اپنی وسیع سیاحت کے دوران کئی دفعہ ہندستان بھی آئے اور مختلف مقامات پر مختلف مدتوں تک مقیم رہے۔ ان کا آنا پہلی دفعہ ۱۸۵۶ء میں ہوا اور آخری دفعہ ۱۸۷۹ء میں۔ انھیں ہندوستان کی غلامی کا شدید احساس تھا اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ انگریز ہندوستان میں ہندو مسلم اختلافات پیدا کرکے اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں انھیں سرسید احمد خاں مرحوم کی شخصیت اور طریقہ کار سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ان کی بعض تحریروں اور اقوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سرسید کے افکار اور طریقہ کار سے متفق نہیں تھے۔ اور اسے ناپسند کرتے تھے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ انھیں انگریزوں اور دوسرے سامراجیوں سے اتنی شدید نفرت تھی کہ ان سے کسی طرح کا اشتراک و تعاون برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ بہرحال افغانی اور سرسید کی شخصیتوں اور افکار کا موازنہ و مقابلہ بہت دلچسپ اور مفید ہو سکتا تھا لیکن قاضی صاحب نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا قاضی صاحب کو حکیم اجمل خاں سے بہت قریب رہا تھا اور حکیم صاحب کے مراسم اخلاص و مودّت کے تھے اس لئے وہ حکیم صاحب کی زندگی اور شخصیت کے مختلف گوشوں سے گہری واقفیت حاصل کر سکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "حیاتِ اجمل" کے وہ حصّے بہت دلکش اور اثر آفریں ہیں جو حکیم صاحب مرحوم کے شخصی احوال و واردات سے متعلق ہیں۔ ان کے مطالعے سے جس شخصیت کا نقش ہمارے پردۂ ذہن پر اُبھرتا ہے اُس کے اجزائے ترکیبی میں قدیم و جدید کا بڑا دل آویز اور حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے۔ اگر ایک طرف وہ ہماری قدیم تہذیب کے اوصاف یعنی شائستگی، شرافت اور وضع داری کے حامل تھے تو دوسری طرف تہذیب جدید کی خصوصیات یعنی ترقی پسندی، رواداری اور عوام دوستی سے بھی اُنھیں حصّہ وافر ملا تھا اور ذاتی طور پر وہ بہت متحمل مزاج، خوددار اور متین و بردبار تھے۔ قاضی صاحب نے ان کی شخصیت کی نقش آرائی اس طرح کی ہے کہ انکی یہ سب خوبیاں پوری طرح نمایاں ہو گئی ہیں۔ حکیم صاحب کی وفات کا حال قاضی صاحب نے "آخری شام" کے زیر عنوان کچھ ایسے خلوص و محبت سے لکھا ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے جذبات پر قابو رکھنا اور آنکھوں کو اشک باری سے روکنا دشوار ہو جاتا ہے۔ حکیم اجمل خاں کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ان خوابوں کی شکست تھا جو انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں دیکھے تھے، بالآخر یہی غم ان کے دل کا روگ بن گیا اور جان لے کر رہا۔

"آثارِ ابوالکلام آزاد" کی حیثیت مختلف ہے۔ یہ دراصل مولانا آزاد کے نفسیاتی مطالعے کی کوشش ہے اور اس لحاظ سے غالباً اردو ادب میں اس کا مقام منفرد ہے۔ اسکے دو حصّے ہیں، پہلا حصّہ سوانحی ہے اور دوسرا نفسیاتی۔ قاضی صاحب نے دوسرا حصّہ پہلے لکھا اور وہی ان کا مقصد تھا لیکن بعد میں ناشرین کے اصرار سے پہلے حصّے کا اضافہ کیا۔ اس سے میری رائے میں یہ فائدہ ہوا کہ قاری کو مولانا کے سوانح کی روشنی میں قاضی صاحب کی کوشش کو پرکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی زیادہ سہولت حاصل ہو گئی۔ انھوں نے مولانا کی نفسیات کا سُراغ اُنکی تحریروں اور خصوصاً "غبارِ خاطر" میں لگانے کی کوشش کی ہے لیکن کتاب کے شروع ہی میں یہ اعتراف کیا ہے

کہ "کتنا مشکل ہے۔ کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کرنا اور اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اس اندیشے کو دل سے نکالنا کہ کہیں ہم غلط اندازہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے بھی جب ان اوراق کو لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو اس تردد کو دل سے نہ نکال سکا۔" اس تردد کے علاوہ میرے خیال سے قاضی صاحب کی دوسری مشکل یہ تھی کہ مولانا آزاد کی شخصیت کے گرد عظمت کا ایسا حصار کھنچا ہوا تھا کہ اس کے اندر جھانک کر دیکھنا ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں تھا جو نسبتاً مولانا سے قریب تھے اور جن پر مولانا یک گونہ شفقت فرماتے تھے۔ اسی لیے قاضی صاحب مولانا کی نفسیات کو سمجھنے میں اُتنی دور تک جا سکے ہیں جتنی دور تک انکی تحریروں کی مدد سے جانا ممکن تھا اس سے آگے نہیں اور اس میں بھی بقول قاضی صاحب ایک بڑی دشواری یہ تھی کہ انھوں نے "اپنی اس نثر میں شعر کی تمام لطافتیں اس طرح سمو دی ہیں اور شاعرانہ اشارات و کنایات سے اس قدر کام لیا ہے کہ تنقید و تبصرے کی راہ دشوار گزار ہو گئی ہے اور مغالطے سنگ راہ ہو سکتے ہیں۔ ان کی شعریت نے چادر بن کر ان کے حقیقی تاثرات کے چہرے کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ بعض مقامات پر تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس نقطے پر شاعری ختم ہوئی اور حقیقت شروع ہوئی۔" ایسے موقع پر قاضی صاحب نے بھی مولانا کی طرح شاعرانہ اشارات و کنایات ہی سے کام لینا مناسب سمجھا ہے اور "تنقید اور تبصرے کی راہ" کو اور زیادہ "دشوار گزار" بنا دیا ہے۔ قاضی صاحب کے نزدیک مولانا کی شخصیت کے سب سے اہم اجزاء ان کی انفرادیت اور انانیت ہیں اور ان دونوں اجزا کے عوامل اور آثار سے قاضی صاحب نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ مولانا کی اس انانیت کا نتیجہ ایک طرف ان کی بلند خیالی اور عالی ہمتی کی صورت میں نکلا اور دوسری طرف "تنہائی پسندی" کی صورت میں قاضی صاحب نے ان کی تنہائی پسندی کی توجیہہ "غمگین احساس" سے کی ہے اور اس کا سبب "فطرت کا کمال" بتایا ہے۔ سیاسی زندگی کے نشیب و فراز نے یہ احساس اور بھی تیز کر دیا تھا اور قاضی صاحب نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اگر اس کے کچھ اسباب تھے تو ان کا سراغ مولانا کی تحریروں میں نہیں ملتا ہے اور اس لئے قاضی صاحب بھی اس

بارے میں خاموش ہیں۔ بہر حال "آثارِ ابوالکلام آزاد" کو اس لحاظ سے قاضی عبدالغفار کی تصانیف میں امتیازی درجہ حاصل ہے کہ یہ ہمارے سوانحی ادب میں ایک نیا تجربہ ہے جو بڑی حد تک کامیاب ہے۔

آثارِ ابوالکلام آزاد اور حیاتِ اجمل میں قاضی صاحب کے قلم کا خاص جوہر یعنی طنز و شوخی بھی جگہ جگہ نمایاں ہوا ہے، بالخصوص ملک کی فرقہ وارانہ صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے فرقہ وارانہ سیاست کے قلعہ داروں کی خوب خوب قلعی کھولی ہے۔ ملک کی تقسیم کے بارے میں مسٹر محمد علی جناح اور مولانا آزاد کے طرزِ فکر کا موازنہ کرنے کے بعد "آثارِ ابوالکلام آزاد" میں لکھتے ہیں:

"حال کے واقعات نے اس گمان کی پوری پوری تصدیق کردی ہے کہ جو کمزور عمارت پاکستان نے بنائی ہے اس کی دیواریں تیسری طاقت کی تائید اور عملی امداد کے بغیر کھڑی نہیں رہ سکتیں۔ اب اسلام کے نعروں سے زیادہ اسے امریکی سامانِ جنگ کی ضرورت ہے!!" اسی موضوع پر ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:۔ تقسیم کی تجویز کے متعلق مولانا نے (امریکہ کے صحافی) فشر سے فرمایا تھا کہ

"میں شادی سے پہلے طلاق کے کچھ معنی نہیں سمجھتا۔ اگر ہندو اور مسلمان یکجا زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں اور ناکام رہیں تب ہی جدائی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔" لیکن جدائی کا سوال تو تیسرے فریق کا پیدا کیا ہوا تھا جو عوام کی جہالت اور ان کے لیڈروں کی خود غرضیوں سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ صرف اسی لئے نکاح سے پہلے طلاق کی یہ صورت پیش آئی"۔ حیاتِ اجمل میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور اس دور کے دوسرے مسلمان رہ نماؤں کی فراخ دلی اور چھوٹوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر کرتے ہوئے ان کا موازنہ مسلم لیگ کی "قیادتِ عظمیٰ" کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں "کس قدر بُعد المشرقین تھا اس زمانے کی قیادت اور بعد کی قیادتِ عظمیٰ" کے درمیان! دیکھنے والوں نے اپنی آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھے کہ "قائدِ اعظم" کے حضور میں ان کے قریب ترین شرکائے کار بھی دم مارنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ جس کسی نے ایک دفعہ مزاجِ قیادت کے خلاف ایک سانس لی اور ایک حرف عرض کیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مردود قرار پایا۔ لکھی جائے تو ایسے لوگوں کی ایک لمبی فہرست تیار ہو سکتی ہے"۔ ۱۹۲۳ء میں ہندو مسلم اختلافات اور دونوں فرقوں کے رہ نماؤں کی خود غرضیوں کا

ماتم کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "لیکن نان کواپریشن کا پروگرام اب صرف کاغذ ہی پر باقی تھا۔ اب حکومت سے ترک موالات کے بجائے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے ترکِ موالات کرنے میں مشغول تھے اور ملک کی جو طاقتیں فرقہ داری فتنے کو روک سکتی تھیں۔ وہ خود ہی غصہ، انتقام اور تعصب کے ادنیٰ جذبات میں مبتلا تھیں۔ مردہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے۔"

علاوہ ان مستقل تصانیف کے قاضی عبدالغفار نے بعض اہم شخصیتوں پر مختصر مضامین بھی سپرد قلم فرمائے ہیں۔ اور ان میں دو مضامین کا ذکر بے محل نہیں ہوگا۔ ایک مضمون "سروجنی دیوی" پر ان کی وفات کے بعد "آج کل" دہلی کے ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۴۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور دوسرا "جواہر لال نہرو" پر "نئی زندگی" الہ آباد کے نومبر سنہ ۱۹۵۰ء کے شمارے میں۔

یہ دونوں مضمون عام روش سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں اور قاضی صاحب کی ادبی صلاحیتوں کے غماز ہیں۔ دونوں مضمون اگرچہ مختصر ہیں لیکن ان کے مطالعہ سے سروجنی دیوی اور جواہر لال نہرو دونوں کی شخصیت کے بنیادی عناصر پوری طرح اجاگر ہو جاتے ہیں۔ سروجنی دیوی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

"چالیس برس گذرے جب اس ملک کی تھکی ہوئی زندگی کے ایک دھندلے اور غمگین افق پر سروجنی کی شعریت کی توس و قزح سے اس زمانے کے نوجوانوں نے، جن میں ایک میں بھی تھا، تھوڑا سا رنگ اور تھوڑی سی روشنی حاصل کی تھی شاعرہ کے ان اشاروں میں زندگی کا ایک پیام تھا جسے ہم نے بہت مدت کے بعد سمجھا"۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کو سروجنی دیوی کی سب سے بڑی دین یہی "شعریت کی توس قزح تھی جس نے میدان جنگ کے تاریک افق کو کسی نہ کسی حد تک روشن کر دیا اور آزادی کے سپاہیوں کی زندگی میں کسی قدر رنگ و نور کی آمیزش کر دی۔ سروجنی دیوی نے ناامید اور مایوس ہونا نہیں سیکھا تھا اور نہ وہ چاہتی تھیں کہ ناامیدی اور مایوسی کا سایہ ان کے رفقائے کار کی زندگیوں پر پڑے۔ انھوں نے اپنی شاعری اور اپنی خطابت اسی کام کے لیے وقف کر دی تھیں۔ قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں: "اس طرح اپنی زندگی کو اور اپنے ساتھ اپنی ملت کی زندگی کو انھوں نے "دلوں کی تمناؤں سے قریب تر ایک بہتر سانچے میں ڈھالا"۔ اور یہ سب سے بڑی وراثت ہے جو انھوں نے آزاد ہندوستان کے لئے چھوڑی ہے"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سروجنی دیوی

شاعرانہ تخیلات کی اسیر ہونے کے بجائے شاعری کو قوم کی خدمت کا آلۂ کار بنانے میں کامیاب ہوگئیں۔

قاضی صاحب کا ارشاد ہے "وہ کبھی اپنی شاعری میں گم نہیں ہوئیں بلکہ بارہا زندگی کے خار دار حقائق کو بھی انھوں نے اپنی شاعری میں تحلیل کر لیا۔ وہ جب جیل خانوں میں قید رہیں تب بھی ان کا ریشمیں رشتہ (قوم سے) قائم رہا اور جب انھوں نے مسندِ حکومت پر قدم رکھا تب بھی ان کے نام کا سکہ دلوں میں جاری رہا۔

"جواہر لال نہرو" پر اپنے مضمون میں قاضی صاحب نے سب سے زیادہ زور ان کی انسانیت پر دیا ہے اور لکھا ہے: "کسی ایسے زمانے میں جب اس انقلابی دور کا کوئی انسان زندہ نہ ہوگا، جب کوئی آنے والا مورخ اپنی تاریخ کے نگار خانے میں اس زمانے کی تصویریں آویزاں کرے گا اور ان میں سے بعض کے نیچے وہ لکھے گا کہ نسل انسانی کے یہ وہ لوگ ہیں جو میری تصویروں میں پوری طرح نہیں سماتے تو ان تصویروں میں ایک تصویر جواہر لال نہرو کی ہوگی۔ ہماری تصویر کا داستان گو اس تصویر پر لکھے گا کہ یہ شخص آزاد ہندستان کا پہلا وزیر اعظم تھا مگر اس عہدے سے اسکی بڑائی کچھ زیادہ ظاہر نہیں ہوتی۔ اس کی بڑائی اس عہدے میں نہ تھی بلکہ اس عہدے کی بڑائی اس کی انسانیت میں تھی۔" ساتھ ہی انھوں نے پنڈت جی کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ مستقبل کے معمار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ انسانیت کی تمام اعلیٰ اقدار اور بیش قیمت روایات کے وارث اور امین ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک اچھا معمار وہی ہو سکتا ہے جو ماضی کے تعمیری کارناموں سے ناواقف اور بے بہرہ نہ ہو بلکہ ان کارناموں کو بنیاد بنا کر مستقبل کی تعمیرِ نو کا نقشہ بنائے۔ ان کی وطن دوستی مقامی سرحدوں میں محدود ہو کر نہیں رہ گئی بلکہ بقول قاضی صاحب "وہ اپنی ذہنی فضا میں صرف کسی ایک ملک یا صوبہ یا بڑا اعظم کی شہریت سے گذر کر عالم گیر شہریت کے دائرے میں داخل ہوگئے۔ دنیا میں شاید ایسے چند ہی افراد ہیں جنھیں عالمی شہریت کا امتیاز حاصل ہوا" بعض کوتاہ نظر لوگ یہ الزام لگا سکتے ہیں کہ "جواہر لال نہرو کے افکار کا رشتہ زیادہ تر ایشیا اور ایشیائی ممالک ہی سے زیادہ استوار ہے"۔ لیکن

اس کا جواب قاضی صاحب نے یہ دیا ہے "اس کا سبب کوئی نسلی، مذہبی یا وطنی تعصب نہیں ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی انسانیت (جس طرح ہر بڑے انسان کی انسانیت) مظلوم کی طرف زیادہ جھکتی ہے"۔ اس میں شبہہ نہیں ہے کہ انسانیت دوستی، ماضی سے رشتہ رکھنے کے باوجود مستقبل کے تقاضوں سے باخبری اور وطن پرست ہوتے ہوئے نسل، مذہب اور دوسرے محدود دائروں سے گزر کر "عالمگیر شہریت کے دائرے میں داخل" ہونے کا جذبہ۔ یہ تینوں ایسی خصوصیات ہیں جو بڑی حد تک پنڈت نہرو کی شخصیت کا احاطہ کر لیتی ہیں۔

ہمارے بعض دوسرے سوانح نگاروں کی طرح قاضی عبدالغفار نے بھی اپنے ہیروؤں کی زندگی کے روشن پہلو ہی دیکھے اور دکھائے ہیں اور ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ انھوں نے سوانح نگاری کے لئے جن شخصیتوں کا انتخاب کیا ان سے وہ اس قدر متاثر تھے کہ ان کے کمزور پہلوؤں کی طرف ان کی نظر ہی نہیں گئی اور دوسری یہ کہ قاضی صاحب ہماری قدیم شرافت اور وضع داری کا ایک نہایت دلکش اور حسین نمونہ تھے اور جیسا کہ مضمون کے شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ ہماری قدیم شرافت اور وضع داری کمزور پہلوؤں کی عکاسی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ تاہم قاضی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بڑا حسن، دل کشی اور رعنائی ہے اور یہ دل کشی اور رعنائی جذبات خلوص وعقیدت کی میناکاری کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ ساتھ ہی انھوں نے جن بزرگوں کا نقشِ حیات صفحۂ کاغذ پر مرتسم کیا ہے ان کی جیتی جاگتی تصویر ہماری نظروں کے سامنے کھینچ دی ہے اور یہ اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔

حنیف رامے

فن کی ولادت

بالزاک کے ایک پادری کی بیگم صاحبہ ذرا دل پھینک واقع ہوئی تھیں۔ پادری کو ایسی خور شمائل عورت کے بارے میں یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ وہ دن دھاڑے اوروں سے آنکھ مچولی کھیلتی پھرتی ہوگی۔ بہر حال جب لوگوں نے پادری کے بہت ہی کان بھرے کہ حضرت کچھ گھر کی خبر لیجئے، تو بیچارے نے تحقیق کی ٹھانی ایک دن بے وقت گھر پہنچے تو بیگم صاحبہ کو ندارد پایا۔ حواس باختہ ہو کر الٹے قدموں ان صاحب کے یہاں جا دھمکے جن کے بارے میں لوگوں نے انگشت نمائی کی تھی اور چھوٹتے ہی یہ مطالبہ کیا کہ نکالو میری بیوی۔ ظاہر ہے اس وقت وہ صاحب اور پادری کی بیگم صاحبہ باہم لطف اندوز ہو رہے تھے، انھیں یہ دخل اندازی بہت کڈھب محسوس ہوئی۔ عاشق جز بز ہوتا دیکھکر پادری کی بیگم صاحبہ کو اس کی طبیعت بحال کرنے کا ایک مزیدار طریقہ سوجھا۔ کہنے لگی تم ذرا کپڑے پہن میرے میاں سے ملو اور اگر وہ یہاں میری موجودگی پر اصرار کرے تو اسے میرے پاس اندر لے آنا، میں یونہی ننگی پڑی رہوں گی، بس اپنا چہرہ ڈھک لوں گی، تم اس سے کہنا کہ لیجئے اپنی بیوی کو پہچان لیجئے۔ اس اندھے نے تو کیا پہچان۔ پادری نے بہتیرا الٹ پلٹ کے دیکھا۔ لیکن یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ چہرہ دیکھے بغیر بھلا کیا پتہ چل سکتا ہے کہ یہ محترمہ کون ہیں۔ بس یہ سمجھئے کہ فن کار ان پادری صاحب کی ضد ہوتا ہے۔ وہ چیزوں کو ان کے چہرے سے نہیں پہچانتا۔ وہ تو پوری چیز کو دیکھتا ہے اور وہ بھی صرف آنکھوں سے نہیں بلکہ اپنے پورے وجود سے۔ میرے ایک شاعر دوست کی عادت تھی کہ وہ اپنی غریبی پر ہنستے ہوئے ایک خاص مذاق کیا کرتے تھے۔ جہاں کہیں انھیں کوئی گری پڑی چیز نظر آتی تو وہ کہتے ''لو بھئی یہ ایک اینٹ مل گئی ہے اب اسے مکان میں لگوا دینا چاہئے'' یا ''لو بھئی ایک پہیہ مل گیا ہے اب اسے آہستہ آہستہ سائیکل لگوا دیں گے۔ فن کار کو تو حقیقت کا کوئی سرا، کوئی نقطہ نظر آجائے پھر وہ اس کے

گرداگرد اک جہان آباد کرنے کا آغاز کر دیتا ہے، اس کی نظر اس ایک مقام کے ماضی اور مستقبل میں گھومنا شروع کر دیتی ہے، اس کی بصیرت اس مقام کے عالم امکان سے ایسے عناصر چن چن کر جمع کرنے لگتی ہے جو اس مقام کے اوپر ایک مکمل اور متوازن عمارت کھڑی کرنے میں کام دے سکیں۔ یہ سلسلہ اس کے اندر اور باہر اس کے شعور اور لاشعور میں اس کے خیال و خواب میں جاری ہو جاتا ہے، اور جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ دن پورے ہو جاتے ہیں اور ان عناصر کی ایک وحدت جنم لینے کے لئے اس کے وجود میں کروٹیں لینے لگتی ہے۔

فن کے جنم کا لیکن صرف یہی ڈھنگ نہیں۔ فن ولادت کا طریق الٹ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ احساساتی جذباتی، خیالی اور خوابی تجربے، حقیقت اور امکان کے وہ لمحات۔ جو ابھی فنکار کے وجود میں باہم شیر و شکر نہیں ہو پائے اچانک کسی معمولی یا غیر معمولی واقعے کی محسوس یا غیر محسوس مدد سے ایک وحدت میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس موقع پر خود فنکار حیران رہ جاتا ہے کہ یہ طوفان کہاں سے امڈ پڑا لیکن جب یہ کبھی طوفان اکثر آتا رہتا ہے تو فنکار اس کا منتظر رہنے لگتا ہے اور کبھی کبھی برسوں ایسا نہیں ہوتا بلکہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ چند برسوں کے بعد فن کار کی زندگی فن کو جنم دینے کی صلاحیت ہی سے خالی ہو جاتی ہے، ویسے ہی جیسے عورت ایک عمر کو پہنچکر بچہ جننے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔

عورتوں کے بچوں کی طرح فنکار کی تخلیقات بھی جائز اور ناجائز ہو سکتی ہیں۔ ہر وہ فن پارہ جو فنکار کے وجود کے روشن یا تاریک میدانوں میں اپنی جڑیں نہیں رکھتا، اس کے اپنے رحم میں، خواہ جانے خواہ ان جانے طور سے نہیں پلا وہ نطفہ نا تحقیق ہے۔ اسے نقالی کہتے ہیں یا وہ کچا بچہ کہلا سکتا ہے۔ البتہ اس کو وجود میں لانے کے لئے جو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے وہ ہو سکتا ہے ایک جائز یا سچی تخلیق میں بھی نہ اٹھے۔ دردزہ کی کوئی قدر نہیں کہ اگر کسی فن کار نے کسی کام پر زیادہ محنت کی ہے تو وہ لازماً زیادہ قابل قدر ٹھہرے۔ فن کی ولادت میں جو محنت اٹھتی ہے وہ تمام وجدانی کیفیتوں کے باوجود اکثر واقعی کڑی ہوتی ہے لیکن یہ لازم نہیں کہ یہ محنت اظہار یا تشکیل ہی کے موقع پر سامنے آئے۔ ایسے بھی بے شمار واقعات ہیں جب کوئی فن پارہ کسی ظاہری وقت کے بغیر ہی ہئیت اختیار کر لیتا ہے جیسے کوئی نظم یا شعر گھڑا گھڑایا نازل ہو جائے۔ یہ الگ بات ہے اندر ہی اندر

وجود کی تاریکی میں اس کا بیج پلتا رہا ہو جیسے کوئی بچہ ماں کو دُکھ دیئے بغیر جھٹ پٹ پیدا ہو جائے اب اس کا یہ مطلب تو ظاہر ہے ہرگز نہ لینا چاہیئے کہ چونکہ ایک ولادت آسمانی یا دقت سے ہوئی ہے اس لئے وہ ناجائز یا جائز ہے۔

اب ایک سوال سیدھا ہو کر سامنے آتا ہے: کوئی انسان فن کار کیوں بن جاتا ہے اور فن کی تخلیق فن کار پر کب تک کھلی رہتی ہے؟ اس ایک سوال سے جو ضمنی سوال اور پھوٹیں گے ان پر ضمناً بات چلتی رہے گی۔

عام انسان زمان و مکان کی عام وسعتوں کے اسیر ہوتے ہیں، وہ زندگی کی بھنور میں خس و خاشاک کی طرح چند چکر کاٹتے ہیں اور اسی میں ڈوب جاتے ہیں۔ وہ وقت کے دریا میں بہتے چلے جاتے ہیں، دریا تیز تو وہ بھی تیز دریا نرم رو تو وہ بھی نرم رو، دریا کا رُخ بدلے تو ان کا رخ بدلتا ہے ورنہ نہیں وہ متحرک تو ہوتے ہیں لیکن اپنی حرکت کی نوعیت اور معنویت سے غافل یا بے پروا۔ البتہ چند انسان اس چل چلاؤ کی فضا میں کچھ گھٹن یا کمی محسوس کرتے ہیں اور اس سے ذرا الگ تھلگ ہو کر اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کی معصومیت ابھی باقی ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے مناظر کو ایک بچے کی طرح دیکھتے اور حیران ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی ذہنی تربیت خالص وقتی فائدوں کی پابند نہیں ہوتی، وہ زندگی پر حکیمانہ طرز اور انداز سے غور کرنے لگتے ہیں، پہلے لوگ فن کار بن سکتے ہیں اور دوسرے فلسفی۔ یہ لازم نہیں کہ ہر معصوم انسان فن کار بن جائے یا ہر ذہین انسان فلسفی۔ فن ہو یا فلسفہ، ان کی آبیاری کے لیے ایک مستقل اور مستقیم طرز عمل درکار ہے۔ بات سُوجھ جایا کرتی ہے۔ لیکن اسے متشکل کرنا، ہیئت دینا بڑا کٹھن کام ہے اور اسے کسی بصیرت یا کسی انداز نظر کا جزو بنانا اور بھی محال ہے۔

جب کوئی فن کار زندگی کے مناظر کا محض حصہ ہونا چھوڑ کر ان پر حیران ہونا اور انھیں سمجھنے کی کوشش شروع کرتا ہے تو گویا وہ اپنے بھائی بند انسانوں سے ایک سطح پر کٹ جاتا ہے۔ اب وہ زندگی میں شریک بھی ہوتا ہے اور اس کا مبصر بھی۔ یہیں سے اس کی تنہائی کا آغاز ہوتا ہے۔ جس سے اس کی شخصیت اور طرز عمل عام لوگوں سے الگ شکل اختیار کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ وہ بظاہر انہی

جیسا ہوتا ہو ابھی ان سے یکسر الگ طرح کا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی تنہائی اس کو عام انسانوں کی طرح کاٹتی نہیں۔ اس کی تنہائی تو اس کی تخلیقات کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ یہیں تو اسے اپنے پورے وجود کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا موقع ملتا ہے یا یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا وجود پارہ پارہ ہونے کے بجائے ایک وحدت ہے۔ سالمیت کا یہ احساس اسے ایک سرور اور اعتماد بخشتا ہے۔ اس کی تنہائی اسے وقت کے رواں دھارے سے نکال کر ایسے لمحات اس پر کھول دیتی ہے جہاں وقت دائم ہوتا ہے، جہاں وقت ماضی و حال و مستقبل کی صورت میں بٹا ہونے کے بجائے صرف اسی سیدھ یعنی ماضی سے مستقبل کی جانب بہنے کی بجائے پورے کا پورا ایک ہی جگہ موجود ہوتا ہے۔ اس کی تنہائی اسے اس کے وجود سے باہر کی دنیا کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کی دنیا سے بھی متعارف کراتی ہے۔ اور اگر وہ اپنے وجود کی تاریکی سے خواہ مخواہ دامن نہیں چراتا تو وہ آئے دن لحظہ بہ لحظہ اس دنیا کی گہرائیوں میں اترتا رہتا ہے اور یوں اپنی پوری نسل بلکہ پوری انسانیت کے تجربے کا شناور بنتا جاتا ہے۔ جب اسے اس تاریکی میں اپنا وجود تمام دوسرے انسانوں کے وجود سے ہم رشتہ محسوس ہوتا ہے تو یہ احساس واضح ہوتے یا پنہاں رہتے ہوئے اسے ایک اور جانب بھی لے جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ جس فطرت کا پروردہ ہے وہ مردہ نہیں، اس میں قوت کے ذخیرے چھپے ہیں، اس کے مظاہر۔ یہ پیڑ پتے، یہ پھول پھل، یہ چاند تارے۔ محض مادی اجسام نہیں ان میں تو جان ہے، معنی ہیں، پیغامات ہیں۔ خاموشی کی ان آوازوں پر وہ اسی طرح کان دھرنے پر آمادہ رہنے لگتا ہے۔ جیسے لوگ لوگوں کی بات سنتے سناتے ہیں۔ وہ باتیں جو آج ژنگ، سری آروبندو و شروڈنگر اور وہائٹ ہیڈ ہمیں انسان اور فطرت کے بارے میں بتا رہے ہیں، فن کار اپنی معصومیت کے سہارے ہمیشہ سے عیاں یا پنہاں انداز میں، تھوڑی یا بہت، جانتا اور مانتا چلا آیا ہے۔

غالب کے دو شعر ہیں:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا — کیا بے تاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

زمان و مکان کا یہ بدلا ہوا احساس فن کار کو سکھاتا ہے کہ جو کچھ بظاہر موجود ہوتا ہے وہی سب

کچھ نہیں ہوتا، غیر موجود بھی موجود محسوس کیا جا سکتا ہے، جو کچھ نظر نہیں آتا ضروری نہیں کہ وہ موجود نہ ہو۔ فن کار اپنی تخیلی آنکھ اور کان سے بھی دیکھنے اور سننے اور ان کے حاصل پر اعتماد کرنے لگتا ہے۔ اس کا دل اور اس کا دماغ ان تعصبات کا اسیر نہیں رہتا جو صرف کی آنکھ اور کان پر تکیہ کرنے والوں کا خاصہ ہیں۔ گلاب کا رنگ گلابی ہی نہیں ہوتا، سفید، پیلا اور سرخ بھی ہوتا ہے۔ کل کو اگر ماہر زراعت نیلے گلاب پیدا کرے گا تو کیا ہم اسی وقت اس بات کے قائل ہوں گے کہ گلاب نیلا بھی ہو سکتا ہے تخیل کی مدد سے فن کار آج بھی گلاب کو نیلا دیکھ سکتا ہے اور اسے کہیں ضرورت ہو تو اس کا اظہار بھی کر دیتا ہے اس میں آخر کیا قباحت ہے۔ آسمان نیلا ہی نہیں ہوتا سفید، سرمئی اور کالا بھی ہوتا ہے۔ پھر وہ لال کیوں نہیں ہو سکتا ہے، سبز کیوں نہیں ہو سکتا، پیلا کیوں نہیں ہو سکتا۔ عین ممکن ہے کسی ہمارے لئے اجنبی سرزمین میں ایسا ہوتا ہو یا چند حالات میں ایسا ہمارے یہاں بھی ہو جائے۔ پھر کیا ظاہر ہی تمام حقیقت ہے، نہیں، فن کار یہ بات نہیں مانتا۔

فن کار کا یہ انکار اصل میں ایک اقرار ہے —— اس بات کا اقرار کہ فطرت، انسان اور انسانی معاشرت کی موجود و معلوم شکلیں ہی سب کچھ نہیں۔ فطرت اور انسان بذاتہ اتھاہ ہیں اور ان کا باہمی رشتہ قائم رہتے ہوئے بھی، نت نئی صورتیں اختیار کرتا رہتا ہے۔ پھر انسان کی شخصیت کے بارے میں جوں جوں انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے انسانی وجود کے اندر اور باہر کی تاریکی کا محیط پھیلتا جاتا ہے، جوں جوں ہم انسان کے بارے میں جانتے جاتے ہیں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کے بارے میں ہماری لاعلمی کا رقبہ بھی بڑھ رہا ہے۔ پھر انسان جب باہم ملتے ہیں تو حساب کا سیدھا اُصول یعنی دو جمع دو نہیں چلتا۔ دو انسان یا ایک معاشرہ یا ایک گروہ اپنے ترکیبی ارکان کے انفرادی وزن یا قیمت کے مجموعے سے زائد ہوتا ہے یعنی یہاں دو جمع دو پانچ یا چھ یا اس سے بھی زائد ہو جاتے ہیں اور جب فن کار اس احساس کا اقرار کرتا ہے تو اس کے یہاں ایک قبولیت ابھرتی ہے جو عام انسانوں کے بجائے پیغمبروں کا خاصہ رہی ہے۔

اس قبولیت کے پیچھے فنکار کا ایک اور تجربہ بھی ہے۔ وہ اس بات کا شاہد ہوتا ہے کہ فن کی تخلیق کا معاملہ میکانکی نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جب چاہا، جہاں چاہا، جو چاہا لکھ دیا یا بنا دیا۔ اکثر

ایسا ہوتا ہے کہ بین کے تار جھوٹے پڑجاتے ہیں۔ اکثر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے کچھ کبھی تو نہیں آتا، پھر اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کے اندر کا ساز کسی ان جانی ہوا سے بج اٹھتا ہے اور کوئی راگ خود بخود چھڑ جاتا ہے۔ بعض اوقات نہیں بیشتر موقعوں پر اسے اپنی تخلیقات سے خود بھی اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ وہ خود اس کے لئے ایک خلق جدید کا درجہ رکھتی ہیں خود اسے انھیں پہلی مرتبہ دیکھنے کا احساس ہوتا اور یہ ضرورت محسوس ہوتی کہ انھیں جانا پہچانا جائے۔ خود اسے ان کی معنوی اور صوری دنیاؤں کی رفعت اور عمق کا اندازہ آہستہ آہستہ ہوتا ہے اور بعض اوقات زندگی بھر ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر کبھی یوں ہوتا ہے کہ اس کے اندر بہنے والا ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ، تخلیق کا سوتا، خشک ہونے لگتا ہے، خشک ہو جاتا ہے، برسوں خشک رہتا ہے، یہ خشکی تاحیات قائم رہتی ہے۔ کیا اس کی اپنی ذات کے بس میں ہے کہ وہ اس چشمے کو پھر سے جاری کرلے یا اس چشمے کی اس انداز سے تربیت کرے کہ یہ سدا بہتا رہے، یہ ایک حد تک ممکن ضرور ہے۔ جب فن کار اپنے وجود میں اترنے اور اس کی مختلف تاریک اور روشن سطحوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے کتراتا نہیں، ایک طرح سے اپنے وجود کی سالمیت کو تسلیم کرنے کی خو ڈال لیتا ہے تو اس کے تخلیقی عمل میں اس کے وجود کا کوئی حصہ روڑا اٹکانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس طرح جب مثلاً وجدان، علم اور مہارت ایک دوسرے کی رفاقت کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں تو فن کار کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب اس کی تخلیقی قوتیں معیار اور مقدار دونوں کے اعتبار سے بیش از بیش ثمر آور ہوتی ہیں۔ اس رفاقت کے قیام اور استقلال میں یقیناً فن کار کی ریاضت کو بھی دخل ہے لیکن وہ اتنا انانیت پسند نہیں ہوتا کہ اسے اپنے ہی بازو کا بل سمجھ لے، اکثر وہ اسے خدا کی دین کا نام دیتا ہے، کیوں؟

اگر تخلیق اپنے ہی کس بل پر منحصر ہوتی تو فن کار اسے وجود میں لانے پر ہمہ وقت قادر ہوتا مگر ایسا نہیں بلکہ وہ تو اپنی اکثر تخلیقات کے لئے خود بھی اجنبی ہوتا ہے۔ کبھی یہ چشمہ پھوٹ بہتا ہے اور کبھی یہ سوتا خشک ہو جاتا ہے۔ یہ صورت حال اسے سکھاتی ہے کہ وہ جس ماحول میں رہتا ہے اور جس فطرت میں پروان چڑھا ہے، وہ اندھی اور مردہ نہیں۔ اس زندہ کائنات میں لہریں لیتی ہوئی روح حیات جب جوش میں آتی ہے اور اس کے وجود کو قبولیت کے عالم میں پاتی ہے اس کے خمیر کو اس کے

خیالات، جذبات اور احساسات کو کسی وحدت میں ڈھلنے پر آمادہ پاتی ہے تو وہ اس کی جانب نگاہ کرتی ہے اندریوں اس کے یہاں کوئی گل بوٹا اُگ آتا ہے اور کبھی کبھی یہ رو ایسی جاری ہوتی ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی اور کبھی کبھی بس حملہ سا ہوتا ہے اور فن کار کچھ اسی طرح خالی ہو کر رہ جاتا ہے جیسے کسی پیغمبر پر وحی اُترنی بند ہو جائے اور وہ دل میں ڈرے کہ شاید اس کا مالک خدا اس سے ناراض ہو گیا ہے لیکن شاید ایسا نہ ہو اور یہ خالی وقفہ کسی نئی تخلیق کے امکانات کی پرورش کے لئے ضروری ہو۔ فن کار کا یہ احساس اسے اس مقام پر لے آتا ہے کہ وہ تو اپنے سے بڑی طاقتوں۔ فطرت، اجتماعی اور نسلی لاشعور، فوق الشعور کے ہاتھوں میں ایک ذریعہ یا آلہ ہے جسے یہ طاقتیں اپنے مقاصد یا اپنی طاقت کے اظہار یا اپنی تکمیل کے لئے استعمال کرتی رہتی ہیں۔ فن کار کی تو حیثیت ایک ایسی عورت کی سی ہے کہ اس کی گود بھرنا اس کے اپنے اختیار میں نہیں۔ نطفہ ٹھہرے یا نہ ٹھہرے حمل گرے یا رہے، لڑکا ہو یا لڑکی، خوبصورت ہو یا بدصورت، صحت مند ہو یا مردہ ہی پیدا ہو جائے، زندہ رہے یا دنوں میں اللہ کو پیارا ہو جائے، نیک بنے یا بد، خوش رہے یا ناخوش۔ وہ بیچاری تو کچھ بھی نہیں کر سکتی، بس دُعا کر سکتی ہے، مجسم دعا بن سکتی ہے، خالق اکبر کی مشیت کی تکمیل کا ایک ذریعہ اور یہ کتنا بڑا شرف ہے۔

فن کار کی قبولیت کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ زندگی کو اس کی مکمل صورت میں قبول کرتا ہے۔ وہ زندگی کے حسن ہی کو نہیں اس کے قبح کو بھی اپنے سینے سے لگاتا ہے۔ وہ مسرت ہی کا متلاشی نہیں، وہ غم کو زندگی کا حصہ جانتا ہے۔ وہ سکھ سے نہیں گھبراتا لیکن دکھ سے بھی دامن نہیں چھڑاتا، اسے سچ سے جتنی چاہے محبت ہو وہ یہ نہیں بھولتا کہ زندگی میں جھوٹ بھی رچا ہوا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ زندگی کے موجودہ طرز میں کسی اچھی تبدیلی کا خواہاں نہیں ہوتا۔ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ وہ تبدیلی کی خواہش کے تحت زندگی کے حقیقتوں سے آنکھ بند کرنا پسند نہیں کرتا۔ پہلے وہ زندگی کی صورتوں کو قبول کرتا ہے اس کے تمام قبیح عناصر، اس کے تمام غموں، دکھوں اور جھوٹوں سمیت۔ پھر وہ یہ دیکھتا ہے کہ کون سے قبیح عناصر خواہ مخواہ انسانوں پر لدے ہوئے ہیں کون سے غم، دکھ اور جھوٹ بے اصل اور بے جڑ ہیں، بیکار ہیں۔ وہ بدصورتیاں، وہ غم، وہ دکھ،

وہ جھوٹ جو مختلف اوقات میں انسانوں کے زندہ رہنے میں مدد دیتے ہیں تو وہ انھیں زندگی سمجھتا ہے اور انھیں اہم جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بہت سے حُسن، بہت سی مسرت، بہت سے سکھ، بہت سے سچ کو زندگی سے خالی پائے اور اس کے خلاف ہو جائے۔ اسے ادھوری چیزوں سے چڑ ہوتی ہے، اسے ادھ کچّے اور ادھ پکّے لوگوں سے چڑ ہوتی ہے، اسے تو ترتیب اور توازن چاہیئے، خواہ یہ حُسن میں ملے یا قبح میں، غم میں ملے یا مسرت میں، سکھ میں ملے یا دکھ میں، جھوٹ میں ملے یا سچ میں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اگر ان چیزوں کی زندگی میں جڑ نہیں تو یہ بیکار ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ زندگی، غموں اور ناکامیوں سے بھری ہوئی یہ زندگی اپنی جگہ ایک نشاطیہ تجربہ ہے۔ وہ اس بات کا شاہد ہے کہ غم کی کوئی اصل ہو تو وہ بھی نشاط بن جاتا ہے۔

اب رہا یہ مرحلہ کہ جب اس کا سوتا خشک ہو جاتا ہے تو اس کے لئے کیا راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس وقت اس کے لئے صبر ہی ایک راستہ ہے۔ صبر جس کا مطلب ہے اپنے آپ کو اپنے یا خدا کے خلاف مصروف پیکار کرنے کے بجائے ڈھیلا چھوڑ دینا لیکن ساتھ ہی ساتھ کھلا بھی، کسی نئی تخلیقی رو کی آمد اور قیام اور استقلال کے لئے کھلا۔ ویسے ہی جیسے دانشمند کسان کسی کھیت کی زرخیزی کم ہوتے دیکھ کر خاصے طویل عرصے تک اسے دھوپ کھلنے کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔

شیر افضل جعفری

اجل کے دستِ گدا کو حنا عطا کر دے
لہو کے نور سے خنجر کو چاند سا کر دے

گرے جو ٹوٹ کے تیرے قدم پہ سورج
اُٹھا کے اس کو خرابات کا دیا کر دے

تجھے قسم ہے عروج و زوالِ آدم کی
وہ آہ کر جو مقدّر کو زمزمہ کر دے

شکار کر دلِ زندہ سے مرگ و محشر کو
تو اپنی ذات کو ہمدوشِ کبریا کر دے

تو دشتِ وقتِ غلط گشت میں وہ ٹھوکر کھا
جو تیری لغزشِ پا کو حرم نما کر دے

زمینِ دل پہ اُتر کر انا بشر تو الاپ
عجب نہیں کہ مشیّت تجھے خدا کر دے

حبیب اشعر دہلوی

موجِ انفاس بھی اک تیغِ رواں ہو جیسے
زندگی کارگہِ شیشہ گراں ہو جیسے

مجھ سے وہ آنکھ چراتا ہے تو یوں لگتا ہے
ساری دنیا مری جانب نگراں ہو جیسے

حاصلِ عمرِ وفا ہے بس اک احساس یقیں
وہ بھی پروردۂ آغوشِ گماں ہو جیسے

دل پہ یوں سایہ فگن ہے کوئی بھولی ہوئی یاد
سرِ کہسار دھندلکے کا سماں ہو جیسے

یہ دہکتے ہوئے تارے یہ سلگتے ہوئے پھول
اب تو امید بھی دل کا زیاں ہو جیسے

آج اشعر سے، سرِ راہ، ملاقات ہوئی
کوئی درماندۂ دل، شعلہ بجاں ہو جیسے

کرشن موہن ایم۔ اے

کہیں یہ بات نہ بڑھ جائے، کیسی آن بن ہے
ہمارا دل تو کدورت سے پاکدامن ہے

کبھی جو مولد و مسکن تھا آرزوؤں کا
فغاں کہ آج وہ دل حسرتوں کا مدفن ہے

ستم کہ انجمنِ ناز کے ہیں یہ انداز
زباں کو حکمِ خموشی، نظر پہ قدغن ہے

غمِ فراق میں بھی مسکرا رہا ہوں میں
تمہاری یاد مرے دل پہ جلوہ افگن ہے

نہ اس میں کوئی پیامِ عمل نہ رنگِ خرد
فقیہہ شہر مری شاعری سے بدظن ہے

سہاگ نکھرا ہے دھرتی کا مست ہے سنسار
نظر فروز کسی گلبدن کا جوبن ہے

ہے اسمیں ہندی کا رس، فارسی کی شوکت بھی
عجیب رنگ لئے شعرِ کرشن موہن ہے

شاہد اختر

مہکا ہے گلِ خونِ وفا، جانیے کیا ہو
جلتی ہے کوئی شمعِ حنا، جانیے کیا ہو

بندش ہے نگاہوں پہ، دل وجاں پہ ہیں پہرے
تعبیر تری خوابِ وفا، جانیے کیا ہو

مدت سے کسی زلف کی خوشبو نہیں آتی
مصروفیتِ دستِ صبا، جانیے کیا ہو

شعلہ سا لپکتا ہے کوئی روزنِ در سے
خنداں ہے پھر اک بنتِ حیا، جانیے کیا ہو

ٹھہری ہے صبا، گردشِ افلاک رکی ہے
کھلتا ہے کوئی بندِ قبا، جانیے کیا ہو

باقی ہے ابھی تلخیٔ زہراب لبوں پر
ہے پھر "لبِ ساقی پہ صلا" جانیے کیا ہو

عشرت انجم

ایک سکونِ دل کی خاطر زخموں کو اپنائے کون
جن گلیوں میں پتھر برسیں ان گلیوں میں جائے کون

جس کی باتیں پیاری پیاری جس کا لہجہ سوچ نسیم
تم کو اس کا نام بتا کر دیوانہ کہلائے کون

مہکی یادیں مہکی راتیں مہکی مہکی راہ گذر
سوچ رہا ہوں ان لمحوں کو زنجیریں پہنائے کون

اے میری مجبور وفاؤ خاموشی سے سو جاؤ
گھر کے باہر تاریکی ہے گھر میں دیپ جلائے کون

کوئی ہم آواز نہیں ہے رستے میں سناٹا ہے
تنہائی کے اس سرگم پر گیت سہانے گائے کون

پیار تو ہم پر فرض ہے لوگو جسم جلے یا روح جلے
آگ کے اس دریا میں رہ کر شعلوں سے گھبرائے کون

انجم شہرِ حسن کی پریاں ممکن ہے خوابیدہ ہوں
چاندنی اس نازک تھالی میں پھول سجا کر لائے کون

شہر یار

شمعِ دل، شمعِ تمنا نہ جلا، مان بھی جا
تیز آندھی ہے مخالف ہے ہوا، مان بھی جا

ایسی دنیا میں جنوں، ایسے زمانے میں وفا
اس طرح خود کو تماشا نہ بنا، مان بھی جا

کب تلک ساتھ ترا دیں گے یہ دھندلے سائے
دیکھ نادان نہ بن میرا کہا، مان بھی جا

شہر پھر شہر ہے، یاں جی تو بہل جاتا ہے
شہر سے بھاگ کے صحرا کو نہ جا، مان بھی جا

زندگی میں ابھی خوشیاں بھی ہیں رعنائی بھی
زندگی سے ابھی دامن نہ چھڑا، مان بھی جا

ساقی فاروقی

مجھے خبر تھی مرا انتظار گھر میں رہا
یہ حادثہ تھا کہ میں عمر بھر سفر میں رہا

میں رقص کرتا رہا ساری عمر وحشت میں
ہزار حلقۂ زنجیر بام و در میں رہا

ترے فراق کی قیمت ہمارے پاس نہ تھی
ترے وصال کا سودا ہمارے سر میں رہا

یہ آگ ساتھ نہ ہوتی تو راکھ ہو جاتے
عجیب رنگ ترے نام سے ہنر میں رہا

اب ایک وادیِ نسیاں میں چھپتا جاتا ہے
وہ ایک سایہ کہ یادوں کی رہگذر میں رہا

راج نرائن راز

موت الزام ہوئی جاتی ہے، اب کیا کیجیے
زندگی دام ہوئی جاتی ہے، اب کیا کیجیے

مجھکو کب اپنی تباہی کا گلا ہے لیکن
آپ کے نام ہوئی جاتی ہے، اب کیا کیجیے

عقدہ تقدیر کا اے کاش کہ حل ہو جاتا
عقل بدنام ہوئی جاتی ہے، اب کیا کیجیے

بادۂ فکر برا ہو کہ ہر اک تلخیٔ زیست
تلخیٔ جام ہوئی جاتی ہے، اب کیا کیجیے

جتنے الجھاؤ ہیں رستے میں، حیات اتنی ہی
سبک اندام ہوئی جاتی ہے، اب کیا کیجیے

راز اشکوں کی لڑی کب تھی چراغوں کی قطار
راہ میں شام ہوئی جاتی ہے، اب کیا کیجیے

محبوب خزاں

ویرانۂ خیال میں دنیا نہیں ابھی
اب اس طرح نہ دیکھ کہ اتنا نہیں ابھی

یہ زحمتِ فضول یہ تکلیفِ رائگاں
وہ کون سا نشہ ہے کہ اترا نہیں ابھی

کاکل کی ایک لہر سے جاگیں ہزار شہر
شاید کسی نے حسن کو سمجھا نہیں ابھی

غافل نہیں ہے دل کہ برس دو برس کے بعد
ہوگا وہ انتظار کہ ہوتا نہیں ابھی

سید حرمت الاکرام

چشمِ خونبار کی افسانہ گری بھول گئی
فطرتِ غم مرے دامن کی تری بھول گئی
عشق رسوا تو کبھی سی نہ سکا چاک جگر
عقل کیوں رسم و رہِ بخیہ گری بھول گئی
ترے الطاف کی شامیں ترے غم کی صبحیں
آہ! کیا کیا نہ مری بے خبری بھول گئی
شہرِ نسرین و گل و لالہ تک آتے آتے
ان کا پیغام نسیمِ سحری بھول گئی
ہم بھی کیا کیا نہ پشیمان ہوئے ہیں کہ حیات
خود گری بھول گئی خود نگری بھول گئی
خسروی جشن مناتی ہے کہ اچھا ہی ہوا
زندگی شیوۂ آشفتہ سری بھول گئی
وادیٔ غم کا بتاتی نہیں کوئی احوال
کیا صبا بھی روشِ نامہ بری بھول گئی
جب نہ آنکھوں کو سلیقہ تھا کہ موتی رولیں
نخلِ امید کو وہ بے ثمری بھول گئی
شکوہ ہے بتکدۂ شوق کی ویرانی کو
آرزو لذتِ اصنام گری بھول گئی
لمحہ لمحہ تھا دل افروز و دل آرا حرمتؔ
وہ زمانہ بھی مری خوش نظری بھول گئی

ممتاز راشد اجمیری

ہونٹوں کو سیا ہے تو کبھی اشک پیے ہیں
جیسے بھی ہوا، ہجر کے دن کاٹ دیے ہیں

یہ اشک نہیں آنکھ میں اے ظلمتِ گیتی
پلکوں کی منڈیروں پہ ستاروں کے دیے ہیں

تلخابۂ تنہائی سے جس جا بھی پکارا
لب تیرے خیالوں کے وہیں چوم لیے ہیں

آنکھوں میں نمی، دل میں جلن، روح میں نشتر
جینا اسے کہتے ہیں تو ہم یوں بھی جیے ہیں

ہم بھول گئے کاکل و رخسار کی باتیں
کچھ ایسے حسیں زخم زمانے نے دیے ہیں

یوسف اقبال

پھر فصلِ جنوں کا زور ہوا زنجیر بجی زندانوں میں
پھر دار و رسن کے پہلو پر کچھ بات چلی دیوانوں میں

ماحول غبار آلود ہوا طوفان کی خوشبو آنے لگی
آہوں کے بگولے اٹھنے لگے، افلاس کے ریگستانوں میں

فردا کو جو ہم نے بخشا ہے اُس خونِ جگر کی تابش سے
جھومے گی سحر تصویروں میں پھوٹے گی شفق افسانوں میں

چھوٹا تھا تمہارا ہاتھ جہاں بگڑی تھی وفا کی بات جہاں
دل آج بھی بھٹکا بھٹکا سا پھرتا ہے انہی ویرانوں میں

خوں ہو تو چکا ارمانوں کا اب اور ستم کیا ڈھاؤ گے
اب یاس نے ڈیرے ڈال دیے امید کے نخلستانوں میں

کہتے ہیں مئے گلفام جسے کشتی بھی ہے اور گرداب بھی ہے
یا مے کے سہارے تیر گئے، یا ڈوب گئے میخانوں میں

فردوسِ وطن میں اے یوسف اس طرح گزارے دن ہم نے
جس طرح کوئی پردیس میں ہو جس طرح کوئی بیگانوں میں

ایک خاتون کے پرائیویٹ خطوط

محبوب کے نام!

مرے محبوب! میری کل ہے شادی
مری شادی میں شامل تم بھی ہونا
وہیں گھر میں پڑے سڑتے رہو گے
یہیں آ کر پلاؤ کھا کے، رونا
ہر اک ارمان کو دے دے کے دھکّے
مرے غم کے سمندر میں ڈبونا
میں دیکھوں تم کو زردے کی طرح زرد
نظر آؤں میں پیلی جیسے سونا
ضرور آنا تمھیں میری قسم ہے
نہ اپنی عاشقی کی لاج کھونا!
لپٹ جانا مرے دولہا سے آ کر
گلے مل مل کے یہ کہہ کہہ کے رونا
"سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را"

سہیلی کے نام

مری شادی کا ہے چالیس واں دن
یہاں اک پارٹی ہے تم بھی آنا
نہ آؤ تم جو اس چالیس ویں پر
کیا تم نے کوئی حیلہ بہانہ
تمھاری کاٹ دوں گی آ کے چٹیا
سنوں گی میں نہ باتیں صوفیانہ
مرے "عشرت کدے" پر چھ بجے کل
مٹھائی اور چائے ٹھونس جانا
بوقتِ الوداع آخر میں پیاری
یہ کہہ کر قہقہہ اک تم لگانا
"لوگ غم خواری میں تیری سعی فرمائیں گے کیا
سعی فرمانے تلک بچّے نہ ہو جائیں گے کیا"

ایک دوسری سہیلی کے نام!

دل سے تو آہ آہ کئے جا رہی ہوں میں
ہونٹوں سے واہ واہ کئے جا رہی ہوں میں
یوں زندگی گزار رہی ہوں میں ان کے ساتھ
"جیسے کوئی گناہ کئے جا رہی ہوں میں"
قسمت کے حکم سے مسز الّو بن گئی
الّو سے بھی نباہ کئے جا رہی ہوں میں
اب سوچتی ہوں تجھ کو سکھی ان سے بیاہ دوں
ہموار تیری راہ کئے جا رہی ہوں میں
الّوؤں کے ساتھ ہی نہیں رغبت مجھے سکھی
چانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہی ہوں میں
دیتے ہیں پہلے زور سے میری کمر پر لات
اور اس کے بعد کہتے ہیں شانوں پہ رکھ کے ہات
"کمر کو کر بلند اتنا کہ ہر اک لات سے پہلے
میاں بیوی سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟"

بہت سی سہیلیوں کے نام!

میرے میاں کی شادی خانہ بربادی!
پرسوں رات کے آٹھ بجے طے پائی ہے
خیر سے ان کے ساتھ ہی کل نکلتے ہے
نئی نویلی دلہن بھاگ کے آئی ہے

اے سکھیو! سب ٹیکسیاں لے کر آ جاؤ
میرے انگنا باج رہی شہنائی ہے
آ کے تسلی دے جاؤ بے چاری کو
میں ہنستی ہوں روتی بی ہمسائی ہے
ابھی ابھی اف اس برہن کے آنگن سے
میرے کانوں میں یہ آواز آئی ہے
"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا"

سہیلیوں کے نام ایک اور خط

میرے ننھے عظمت اللہ خاں نے پہلی مرتبہ
الّو کا پٹھا کہا ہے آج اپنے باپ کو
اور میری ساس اس تقریب پہ
اک عظیم الشان دعوت دے رہی ہے
نو بجے کل رات کو
آپ از راہِ کرم
اپنے بچوں اور ظالم شوہروں کے ساتھ ساتھ
حاضر آ کر تناول کیجیے
اور بھی اک بات ہے
آپ میں سے گر کسی کو ہو مرا شوہر پسند
بے تکلف دیجیے پیغامِ عشق
میں بہت ممنون ہوں گی آپ کی!

تبصرہ

تاثرات و تعصبات از نظیر صدیقی۔ شایع کردہ شعبۂ تحقیق و اشاعت۔ مدرسہ عالیہ ڈھاکہ ـــــ قیمت چھ روپے

ٹائپ میں چھپا ہوا تقریباً چار سو صفحات پر محیط نظیر صدیقی کے تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ یقیناً اردو کے تنقیدی ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ عملی اور توضیحی تنقید کی گوناگوں ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے عصری شعر و ادب پر ایسے فکر انگیز مضامین نوجوان ناقد کے وسیع مطالعہ، استواریِ ذہن، قوتِ فیصلہ اور ادبی شعور کے واضح ثبوت ہیں۔ تاثرات و تعصبات میں دس ادبی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں ان تین مضامین کو چھوڑ کر جو ناسخ، منٹو کے گنجے فرشتے اور انشائیہ کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی حمایت سے تعلق رکھتے ہیں، باقی سب مضامین دورِ جدید کے اہم شاعروں (اور ایک نثر نگار لیکن درحقیقت بہت بڑے شاعر، رشید احمد صدیقی) کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں ہیں۔ میں نے ان تنقیدی اور ادبی مضامین کے لئے سمجھنے سمجھانے کا لفظ جان بوجھ کر اسلئے استعمال کیا ہے کیونکہ نظیر صدیقی کے طرز اظہار میں بڑی بے ساختگی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر نہیں، اپنی بات منوانے کی وہ اپیل پائی جاتی ہے جسے تاثراتی کہ سکتے ہیں۔ ان کے مطالعہ نے انھیں تاثراتی حدوں کے اندر ان کا ایک ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر بنا دیا ہے اس لئے ان کے اکثر مضامین بعض دوسرے نقادوں کے خیال سے پیدا ہونے والے ردِ عمل سے تحریک حاصل کرتے ہیں۔ یہ کوئی غلط بات نہیں۔ خیالات کے تصادم ہی سے نئے خیالات وجود میں آتے ہیں اور کبھی کبھی ایک اختلافی یا منفی تصور ایک زیادہ واضح اور مثبت تصور کا نقطۂ آغاز بن جاتا ہے۔ یہ ایک بیدار، متجسس اور سریع الحس ذہن کی پہچان ہے۔ نظیر صدیقی اس حیثیت سے ہمارے ان نوجوان ناقدوں میں ہیں جو کسی لکیر پر نہیں چلتے خود سوچتے ہیں، جو دوسروں سے مرعوب نہیں ہوتے اثر قبول کرتے ہیں۔

یگانہ، فراق، فیض اور جگر پر نظیر صدیقی کے مضامین گہرے اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ

ہیں۔ انھوں نے اپنے نتائج اس وقت نکالے ہیں جب دوسروں کے نکالے ہوئے نتائج انھیں مکمل طور پر آسودہ نہیں کرسکے حالانکہ ایسی حالت میں ہمیشہ ایسا نہیں ہوا ہے کہ خود ان کی آسودگی دوسروں کو بھی مطمئن کرسکے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں ان کا انداز نظر استدلالی ہونے کے بجائے جذباتی اور انفرادی نہیں تاثراتی ہو گیا ہے، پھر بھی مجموعی طور پر انھوں نے توازن اور اعتدال، ذہنی سچائی اور انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ نظیر صدیقی کی قوت بعض مضامین میں صرف مختلف لوگوں کے اعتراضات کا جواب دینے یا ان سے اختلاف کرنے میں صرف ہو گئی ہے انھیں پڑھ کر یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ ان کے پاس اپنی طرف سے کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے لیکن ایسا نہیں ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، وہ ایک منفی بات سے شروع کر کے مثبت تصور تک پہنچ جاتے ہیں اور وہاں ان کی توضیح اور تشریح ایک تخلیقی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بات مندرجہ بالا مضامین میں اتنی کثرت سے پائی جاتی ہے کہ ان کی طرف متوجہ کرنے یا ان کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔

رشید احمد صدیقی پر لکھتے ہوئے نظیر صدیقی ذرا ضرورت سے زیادہ جذباتی اور جانبدار ہو گئے ہیں، ان کے مضمون میں ایک طرح کے تغزل اور غنائیت کی فراوانی ہو گئی ہے اور قلم میں رقص اور مستی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے یہاں تک کہ مضمون تنقیدی ہونے کے بجائے خالص تاثراتی رنگ اختیار کر گیا ہے۔ اپنے تاثرات پیش کرتے وقت نظیر صدیقی نے دوسرے مضامین جس میں استدلالی گوناگونی سے کام لیا تھا، وہ اس میں موجود نہیں۔ اسی طرح گنجے فرشتے اور کچھ اپنی صفائی میں بھی دلچسپ ہونے کے باوجود بعض کمزوریوں کا شکار ہیں۔

میں پھر کہتا ہوں کہ نظیر صدیقی اگر اس روش پر چلتے رہے تو انھیں اردو تنقید کی تاریخ جلد ہی اپنے صفحات میں جگہ دے گی کیونکہ ان کی تحریروں میں روشنی اور گرمی دونوں کا احساس ہوتا ہے۔

سید احتشام حسین

ہمیشہ

مورچھاپ بیڑی

پیجئے



بہترین تمباکو و صاف پتے

اور

ہوشیار کاریگروں

سے

تیار کی جاتی ہے

رفیق اینڈ سنس بیڑی والا احمد گنج الہ آباد

یہ غلط ہے کہ کوئی ایک دوا ہر مرض کے لئے مفید ہو سکتی ہے
لیکن یہ صحیح ہے کہ

روغنِ برق

بہت سے امراض کیلئے اکسیر ہے

روغن برق

رجسٹرڈ

کی ایک شیشی گھر میں رہے تو آپ ان تمام جسمانی امراض کا خود علاج کر لیں گے اور کسی ڈاکٹر کے محتاج نہیں رہیں گے۔ دردِ سر، دردِ کمر، دردِ گردہ، چوٹ، موچ، ورم، زخم، اختنہ، لقوہ، گٹھیا، رعشہ، تشنج، عرق النسا، سینہ و پسلی کا درد، ورم جگر، ورم طحال، ورم مسوڑہ، ورم خصیہ، بواسیر، طاعونی گلٹی، کان کا درد، آنکھ کا درد، سرخی چشم، نزلہ، زکام، لرزہ، بخار، بچوں کی کمزوری و لاغری، پسلی کا چلنا، معمولی پھوڑا یا پھنسی اور بچھو و بھڑ کے ڈنک کے لئے

روغنِ برق

اکسیر ہے۔ اس کی روزمرہ کی مالش اعصاب کو قوت و صحت بخشتی ہے۔ بچوں، بوڑھوں، جوانوں، پہلوانوں اور کھلاڑیوں کے لئے بے حد مفید اور بے مثال ہے

قیمت فی شیشی ۱ تولہ ۶ر آنہ — ۲½ تولہ ۱۲ر آنہ — ۵ تولہ ۱ر — ۱۰ تولہ ۲ر

نیو مون کیمیکل ورکس۔ الہ آباد

ساغر (سہ ماہی) پٹنہ

کا

اختر اورینوی نمبر

جناب اختر اورینوی ربع صدی سے زیادہ سے اردو ادب کی خدمت مختلف جہتوں سے کر رہے ہیں، وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناقد، شاعر، ڈرامہ نگار، ناول نگار اور محقق ہونے کے علاوہ اُردو زبان کے ایک مجاہد، معلم، مربّی اور سحر آفریں خطیب بھی ہیں۔ انہوں نے اہل اردو کی کئی نسلوں کی ذہنی پرورش کی ہے اور اس وقت ان سے تربیت پائے ہوئے اصحاب علم و عمل برصغیر ہند و پاک میں اپنی اپنی جگہ علم و ادب کی قیمتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ساغر کا اختر اورینوی نمبر موصوف کی ان ہی زریں تاریخی خدمات کا بھرپور جائزہ ہوگا۔ اس نمبر کی ترتیب میں ہند و پاک کے مشاہیر اہل قلم حصہ لے رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل حضرات نے لکھنے کا وعدہ فرمالیا ہے جن میں سے اکثر کے مضامین موصول بھی ہو چکے ہیں :۔

پروفیسر نجیب اشرف، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر وقار عظیم جناب شہاب الدین دسنوی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر محمود الٰہی، پروفیسر سید حسن، پروفیسر اختر قادری، ڈاکٹر محمد حسنین، ڈاکٹر احمد حسن، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر سیدہ جعفر، جناب رضا نقوی جناب غلام سرور، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر ذکی الحق، جناب بیتاب صدیقی، پروفیسر اطہر حسن، افصح ظفر، جناب محمد طفیل (ایڈیٹر نقوش) پروفیسر شاہ مقبول احمد، ڈاکٹر معیز الدین، ڈاکٹر مظفر اقبال، ڈاکٹر نذیر امام، پروفیسر منظر شہاب، پروفیسر آصف واسع، محترمہ شکیلہ اختر، محترمہ بدرالنساء، جناب وہاب اشرفی، جناب اطہر مخیر، ڈاکٹر محمد محسن، ڈاکٹر مطیع الرحمٰن، جناب رضا کریم، جناب ہوش عظیم آبادی، جناب لوز اصلاحی، جناب کلیم عاجز، جناب محمد لطیف الرحمٰن، جناب ظفر اوگانوی، جناب محمد نیاز، جناب شمیم احمد جناب قمر اعظم ہاشمی، جناب یونس رمزی۔ ان کے علاوہ بہت سے دیگر مشاہیر اہل قلم نے شرکت کی توقع دلائی ہے۔ مثلاً پروفیسر رالف رسل (لندن) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ جناب نیاز فتحپوری، ڈاکٹر عندلیب شادانی، پروفیسر مسعود حسن رضوی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر مختار الدین آرزو۔ ڈاکٹر عبدالسلام، جناب فضا ابن فیضی، پروفیسر نظیر صدیقی، جناب روش صدیقی وغیرہ وغیرہ۔

جناب اختر اورینوی خود دو مضامین "میری آپ بیتی" اور "میرا نظریۂ فن" لکھ رہے ہیں۔

SHAHKAR ALLAHABADI-   NUMBER 38   Regd No. L 2005.